



مُجْتَبیٰ حسین

سفر لخت لخت

مجتبی حسین

لیکچرشنل پیشگویی اوس دلیل

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

SAFAR-E-LAKHT LAKHT

by
Mujtaba Hussain

Year of 1st Edition 1995
Year of Latest Edition 2011
ISBN 978-81-8223-893-0

Price Rs. 150/-

نام کتاب	سفر لخت لخت
مصنف	مجبی حسین
اولین اشاعت	جنون ۱۹۹۵ء
نازہ اشاعت	۲۰۱۱ء
قیمت	۱۵۰ روپے
مطبع	عفیف آفیٹ پرنس، دہلی۔ ۲

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kudha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph. : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

website: www.ephbooks.com

ترتیب

7	☆ گزارش احوال واقعی
9	1 دوبارہ
14	2 اوریں سے جانے والے بتا
22	3 سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی چیاز میں
26	4 لندن میں ہمیں دُن کرنے کی تیاریاں
34	5 قیام الدین کے گھر ہمارا قیام
42	6 بحر طائفہ میں وصول ہماری زبان کی ہے
49	7 کچھ ذکر خبر دشہر ساقی ناروی کا
57	8 کچھ حال مشتاق احمد یوسفی سے ملاقات کا
66	9 کچھ نقیٰ تنویر کے بارے میں
74	10 پیرس میں مسرور خورشید نے ہمیں مسرور کیا
82	11 حیدر آباد کا جوڑ کر کیا

91	12 ایرپلکٹ میں ہمارا پہلا سفر
98	13 ہم ناشقند سے بول رہے ہیں
105	14 ہم نے اردو میں از بیک کھانا کھایا
112	15 ازبکستان کے اوپوں کے درمیان
119	16 دنیا کے غنور واکب ہو جاؤ
129	17 جدہ میں جشنِ طنز و مزاح — ایک خطبہ صدارت
138	18 رام پور میں روون



انتساب

یار ولدار

شروع

کے نام

گزارش احوالی واقعی

لگ بھگ نصف صدی پہلے میں نے اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر، جو ائمہ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" کے حکم کی تعییں میں، محض اتفاقی طور پر، 12 اگست 1962 کو دن میں ٹھیک ساز ہے وہ بجے مزاح نگاری شروع کی تھی۔ اس کا آغاز فرضی نام کے ساتھ فکاہیہ کالم نگاری سے ہوا۔ دو چار مرس بعد جب اپنے اصلی نام کے ساتھ لکھنے کی ہمت پیدا ہوئی تو انسانوں، شخصی خاکوں، سفر ناموں، روپرたڈ اور نہ جانے کن کن اصناف و اسالیب کو مشرف پر مزاح کیا۔ چنانچہ اتنے لمبے ادبی سفر کے بعد اب مزاح نگاری ہی میری واحد پیچان بن گئی ہے۔ کیا بننا تھا اور کیا بن گئے۔ اب تو کچھ سوچنے کا وقت بھی نہیں بچا۔ یوں بھی اس حسن اتفاق کا خیال آتا ہے تو ہنسی ہی آ جاتی ہے کیونکہ ایک آدمی جب ہنسنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو تقدیر کے جبر کے نتیجہ میں صورت حال بہر حال مختلک خیز بن جاتی ہے۔

1968 میں میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "تکف بر طرف"، شائع ہوا تھا جسے ادبی حقوق میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ بعد میں حیدر آباد سے میری جتنی بھی کتابیں چھپیں ان کی اشاعت کا اہتمام میرے دوستوں بالخصوص میرے مزاح نگار دوست مسیح احمد مرحوم نے کیا۔ اپنے لا ابالی پن کی وجہ سے میں نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے معاملہ میں کبھی شخصی و چھپی نہیں لی۔ مجھے اس بات کا احساس تو تھا کہ ان کتابوں کی کتابت و طباعت کا معیار وہ نہیں ہے جو ہوا چاہئے۔ یوں بھی 1972 میں وطن منتقل ہو جانے کے بعد میری بے ہنگام مصروفیات نے کبھی اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں اس جانب توجہ کر سکوں۔

1989 میں جب میں پہلی بار پاکستان گیا تو میرے کرم فرما مشق خواجہ نے میری مزاح نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا "تمہارا کمال یہ ہے کہ اقص طباعت و کتابت والی ان چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ذریعہ تم نے مزاح نگاری میں بڑا نام کیا ہے، جو پوچھو تو تمہاری بعض

کتابوں کی نا تفصیل طباعت کا یہ عالم ہے کہ یہ کتابیں مطبوعہ ہونے کے باوجود صحیح تو غیر مطبوعہ نظر آتی ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا تھا ”یا خوبہ اور بہ نواز! میں نے جان بو جھ کران کتابوں کی طباعت کے معیار کو بلند نہیں ہونے دیا تاکہ تاریخی کوئی مزاح نگاری کے معیار کی بلندی کا صحیح سمجھ اندازہ ہو سکے۔ طباعت کا معیار اچھا ہو تو لوگ کتابوں کو روا روی میں ہر سری طور پر پڑھ لیتے ہیں۔ چھپے ہوئے متن کی تہہ داریوں اور باریکیوں کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ تاریخی کی گہری توجہ اور پورے سانہاں کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کتاب کی طباعت کا معیار نقص ہو۔“

اُس وقت تک میری دس بارہ کتابیں چھپ چکی تھیں جو نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ ان کے کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔ بالآخر 2000 میں امریکہ میں مقیم میرے بزرگ دوست حسن چشتی نے ایجوکیشنل پبلیشورنگ ہاؤس، دہلی کے تعاون سے میری کتابوں کو طباعت کے اٹلی معیاروں کے ساتھ چھاپنے کا منصوبہ بنایا اور چار تھیم کتابیں شائع کروادیں۔ بعد میں سید احتیاز الدین، احسان اللہ احمد اور رحیل صدیقی نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور اب تک اس سلسلہ کی بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پچھلے دنوں برادر محدثی خان، مالک ایجوکیشنل پبلیشورنگ ہاؤس، دہلی نے مجھے بتایا کہ میرے پیشتر تاریخیں اب بھی میری ان پُرانی کتابوں کو پوچھتے رہتے ہیں جواب نایاب ہو چکی ہیں۔ کیوں نہ ان کتابوں کو طباعت کے حصہ میں معیار اور تقاضوں کے مطابق چھاپ دیا جائے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ چنانچہ زرنظر کتاب محدثی خان کی اسی تجویز کے نتیجہ میں شائع ہو رہی ہے۔ کیا اب میری ساری کتابیں ایجوکیشنل پبلیشورنگ ہاؤس، دہلی کی معرفت تاریخیں کو دستیاب ہو سکتیں گی۔ مجھے امید ہے کہ ان کتابوں کی طباعت کے معیار میں اضافہ کے باوجود میری مزاح نگاری کا معیار (اگر ہے تو) کم تر اور ہے گا۔

محدثی حسین

B - 107, ROYAL ORCHID
RED HILLS
HYDERABAD - 500001

23 اکتوبر 2010

دوا تیکن

”سفر لخت لخت“ ان سفر ماموں کا مجموعہ ہے جو ہم نے ائی (۸۰) کی دہائی میں مختلف ملکوں کی سیاحت کے بعد لکھے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں ہمیں سو ابیدینہ کے لئے پہلی بار ہیر ولی سفر پر جاپان جانے کو موقع ملا تھا۔ جاپان پہلا ملک تھا جو اپنے مخصوص لکھر اور مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے بالکل مختلف اور انوکھا لگا تھا۔ لگنا تھا یہ اشیاء میں ہے اور نہیں بھی ہے۔ سڑکوں اور بازاروں میں دکھائی دینے والا جاپان مغرب کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے لیکن جو جاپان، جاپانی گھروں میں نظر آتا ہے وہ خالص ایشیائی ملک ہے۔ دن بھر عصری مشینوں کو کنشروں کرنے اور جدید کار و باری اور اروں میں کام کرنے والے جاپانی جب شام کو لپنے گھروں میں واپس آتے ہیں تو اچانک ان کا حیلہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ حیلہ ہی نہیں ان کا مزاج بھی یکسر بدل جاتا ہے۔ مغربی لباس کی جگہ جاپانی لباس ان کے بدن کی زینت بن جاتا ہے۔ ہر کمرہ میں جانے سے پہلے چیل تبدیل کئے جاتے ہیں۔ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے اور جاپانی تقدہ و قندہ سے ایک دھرے کی ایسی تقطیم و تکریم کرتے ہیں کہ ہم جیسے ان کی تھیڈ کرنے لگیں تو زندگی بھر کر کے درد سے کراچتے رہ جائیں۔ ان کے کابکی شوز، ان کے کھانے اور کھانے کے انداز، ان کے رقص اور موسيقی اور ان کا رہن سہن سب کچھ ہی مختلف ہوتا ہے۔ تجسس آفرینی اور سحر آفرینی کے معاملہ میں جاپان تب بھی ہمارے لئے منفرد ملک تھا اور کئی ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد آج بھی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم نے جاپان کا سفر نامہ ہر ہڈے اشتیاق اور گھرے تجسس کے ساتھ لکھا تھا۔ سفر نامہ جاپان کو نہ صرف اردو کے قارئین نے بے حد سراہا بلکہ یہ

کئی ہندوستانی زبانوں کے علاوہ خود جاپانی میں بھی شائع ہوا۔

جاپان کے سفر کے بعد ہمیں ۱۹۸۳ء میں تین مہینوں کے لئے انگلستان، فرانس، ہریکے اور کناؤ اجنانے کا موقع ملا۔ اس سفر کا حال بھی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ تھا لیکن انگریزی زبان اور ادب سے واقفیت کی وجہ سے یوروپ اور امریکہ کسی بھی پہلو سے اجنبی نہ لگے۔ یوں بھی ان دنوں بیٹے شمار ہندوستانی یوروپ اور امریکہ آنے جانے لگے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اکثر ہندوستانی خود ہندوستان کے بارے میں اتنا نہیں جانتے تھنا کہ یوروپ اور فریکہ کے بارے میں جانتے ہیں۔ اب ہم ان ملکوں کا حال لکھتے تو کون سا تیر مار لیتے۔ میرے ایک دوست پچھلے اخبارہ برسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ ایک دن وہ ہمیں ایک پب (Pub) میں لے گئے پب کا نام سن کر ہم نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا کہ انگریزی کامائیہ ناز اویب چارلس ڈکنس اس پب میں بیٹھا کرتا تھا۔ انہیں یقین نہ آیا۔ لیکن ہوگلی کے میجر سے جب توثیق ہوئی تو بے پناہ خوش ہوئے۔ لندن میں ہمارے قیام کے دنوں میں وہ ہمیں اکثر ساتھ رکھتے تھنا کہ لندن کے بارے میں ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ اس سفر نامہ میں لندن کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن یہ حال بھی ان لوگوں سے متعلق ہے جن کی مادری زبان اردو ہے اور جنہوں نے لندن کو مغرب میں اردو کا ایک مرکز بنادیا ہے۔ سفر نامہ لندن میں شامل تفصیلات دراصل اردو کی ایک نئی بستی کی تفصیلات ہیں۔ امریکہ میں بھی ہمیں اردو والوں کی صحبت میں عی رہنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی اردو والوں نے ہمیں اتنا مصروف رکھا کہ کسی شریف امریکی سے بات چیت کرنے کی ہلت عی نہ دی۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء میں ہم نے مرحوم سوویت یونین کا دورہ کیا۔ اس سفر میں ہمیں تاشقند، سرقند، بخارا، ما سکو اور ٹینی گراڈ (موجودہ پیشہ گریٹ) جانے کا موقع ملا۔ دورہ سوویت یونین میں ہم نے ازبکستان کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا۔ ما سکو اور ٹینی گراڈ کا حال اس لئے کول کر گئے کہ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سوویت نظام کا اب چل چکا ہے۔ کوربا چوف نئی نئی "اہم احادیث" کے ذریعہ اس نظام کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ ہمیں فسوس اس بات کا ہے کہ ہم ٹینی گراڈ کا حال تفصیل سے نہ

لکھ سکے۔ دنیا میں ہم نے اب تک جتنے بڑے شہر دیکھے ہیں ان میں ہمیں یہ سب سے خوب صورت شہر نظر آیا۔ لیکن اس شہر سے ہمارا جی اس وقت کھٹا ہو گیا جب آجھی رات کو ہمارے ہوئی کے کمرہ پر بلکل سی دستک ہوئی۔ (اس ہوئی میں عام آدمیوں کا داخلہ سخت منوع تھا) ہم نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اکیس بائیس برس کی ایک خوبصورت روی لڑکی اپنے ہنون پر ایک معنی خیز مسکراہٹ بجائے کھڑی ہے۔ پھر اس نے انگریزی اور روی دونوں زبانوں کی ملاوت کرتے ہوئے ہم سے پوچھا ”آپ کے پاس ڈالر چیز؟“

ہم نے کہا ”نہیں ہیں۔“

پوچھا ”اسکاچ ڈسکل اور اپورنڈ سگریٹ ہیں؟“

ہم نے کہا ”یہ بھی نہیں ہیں۔“

بولی ”کچھ روبل تو ہوں گی عی؟“

ہم نے کہا ”وہ بھی نہیں ہیں۔“

قدرے توقف کے بعد بولی ”آپ مسافر ہیں۔ تھک گئے ہوں گے۔ اگر آپ زلفوں کی چھاؤں اور پلکوں کے سایہ میں کچھ دیر گزارنا چاہیں تو بندی حاضر ہے۔ کیا میں آپ کے کمرہ میں آ سکتی ہوں؟“

ہم نے اگشت شہادت سے اسے خاموش کراتے ہوئی سرکوشی کے انداز میں کہا ”آپ اس وقت ہمارے کمرے میں بالکل نہیں آ سکتیں کیونکہ ہمارے کمرے میں ایک اور روی لڑکی پہلے ہی سے موجود ہے جسے ہم ڈال را اور اپورنڈ سگریٹ وغیرہ دینے میں مصروف ہیں۔ بی بی آپ نے بہاں آنے میں فرادری کر دی۔“

وہ غصہ میں کسی اور کمرہ کی طرف چل گئی۔ بعد میں اس مقصوم کو ڈالر ملے یا نہیں یہ معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ہمیں یہ ضرور پتہ چل گیا تھا کہ سو ویسیں نظام کا دم اب نکلا ہی چاہتا ہے۔ دوسرے دن ہم نے ہندروں دوستی انجمن کے عہدیداروں سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ نہ لینڈ بہاں سے

بہت تریب ہے اور خلیج فن لینڈ کے راستہ طرح طرح کی اشیائے تیش یہاں اسمگل ہونے لگی ہیں اور یوں سودیت معاشرہ کوہر باد کیا جا رہا ہے۔ اب ہم انہیں کیا سمجھاتے کہ اس میں بیچاری خلیج فن لینڈ کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا کہ خود کو رباچوف صاحب کا ہے کیونکہ خلیج فن لینڈ کے راستے تو صرف اشیائے تیش ہی اسمگل ہوتی ہیں جب کہ کو رباچوف صاحب تو سالم امریکہ کو سودیت یونین میں اسمگل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہوا بھی بھی۔ روں سے واپسی کے پکھھی عرصہ بعد سارا سودیت نظام مٹی کے ایک گھر وند سے کی طرح گر گیا۔

لیں گراڑ میں ہمیں ایک ضروری کام اس وقت یاد آیا جب لیں گراڑ کو چھوڑنے میں صرف دو گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ ہم نے رات میں نوبجے اپنی مترجم سے کہا، ”محترمہ! آپ نے ہر میتاج (Hermitage) کی سیر کر لی۔ دوسری جنگ عظیم میں ہزاروں کی تعداد میں مرنے والوں کے اجتماعی قبرستان کی بھی زیارت کرائی مگر ہماری ایک چھوٹی سی خواہش رہی جاتی ہے۔ آپ کا مشہور اویب دوستوں فسکی لیں گراڑ میں ہی کہیں دُن ہے۔ ہم اس کی قبر پر حاضری دینا چاہتے تھے۔“ یہ شستے ہی ہماری مترجم نے ہمارا تھوڑا کھڑا کھڑا کیا اور کہا ”جلدی کیجئے، فاف۔“ دو منٹ بعد ہم بھاگتے بھاگتے ہوںکے باب الدال علم پر ہوئے۔ مترجم نے باہر سے کچھ جھانک کر دیکھا۔ پھر بولی ”معاف کیجئے۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ جس قبرستان میں دوستوں فسکی دُن ہے اس کا دروازہ ابھی بند ہوا چاہتا ہے۔ وہ دیکھنے چوکیدار قبرستان کا دروازہ بند کر رہا ہے۔“ چاروں ہم لیں گراڑ میں اپنے محبوب اویب کی آخری آرامگاہ کے بالکل سامنے رہے لیکن کسی نے ہمیں پہنچیں بتایا کہ دوستوں فسکی یہاں دُن ہے۔ یوں بھی اس دھرتی میں صد یوں سے اتنے لوگ دُن ہوتے آئے ہیں کہ کسے پرواہ کر کون کہاں دُن ہے، کیوں دُن ہے اور کب تک دُن رہے گا۔ ہماری مترجم نے قبرستان کے اطراف گئی ہوئی سلاخوں میں سے ایک سفیدی قبر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ رہی دوستوں فسکی کی قبر۔ ہم نے قبرستان کے باہر کھڑے ہو کر اپنے محبوب اویب کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا اور چلے آئے۔ غرض ایسی ہی کئی باتیں ہیں جو اس سفر نامہ میں آنے سے رہ گئی ہیں۔ ہمیں ۱۹۸۸ء میں پاکستان اور ۱۹۸۹ء میں سعودی عرب جانے کی بھی

سعادت نصیب ہوئی۔ ملکوں ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر ہوئے ہیں کہ ملکوں اور جغرافیائی حالات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اصل اہمیت ان انسانوں کی ہے جو ان ملکوں میں آباد ہیں۔ ہمیں یہ بکھرے سفر نامے اس لئے پسند ہیں کہ ان میں بعض کروار اور شخصیتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ انہیں ملکوں کے حال کے طور پر نہیں بلکہ ان انسانوں کے ذکر کے طور پر پڑھا جائے جو ان ملکوں میں آباد ہیں۔

مجتبی حسین

۲۳ / جون ۱۹۹۵ء

200 ANKUR APTS.

PATPAR GANJ

DELHI-110092

اویس سے جانے والے بتا

صاحب اعرصہ تین مرس کا بیت گیا، جب ہم مشرق میں ابھرتے سورج کی دھرتی جاپاں گئے تھے۔ اب ہم پھر پرتوں رہے ہیں اور اب کی بار مغرب میں اس ملک کو جا رہے ہیں جس کی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں سورج کتنا تھک جاتا ہو گا۔ اس کا اندازہ آپ لگاسکتے ہیں۔ سفر جاپاں کے بعد خواہ الناس کا اصرار دن بدن بڑھتا جا رہا تھا کہ ہم کسی اور ملک کا رخ کریں تاکہ یہ جو ہم ہر محفل میں پان کی بجائے جاپاں کو پیش کرتے رہتے ہیں، اس سے انہیں نجات ملے۔ کچھ دور اندر میں احباب نہ جانے کب سے اختیاطاً اپنی جیبوں میں امام ضامن ڈال لے گھوم رہے تھے کہ ہم ادھر عزم سفر کریں اور وہ ادھر ہمارے سباز و پر امام ضامن باندھ دیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ ہمارا ذوق سفر صرف امام ضامن سے نہیں بڑھتا بلکہ پچھی بات تو یہ ہے کہ تو کیوں میں ان امام ضامنوں کے ہاتھوں کشم والوں نے ہمیں خاصاً آزے ہاتھوں لیا تھا۔ کھوٹی چونٹیوں والے امام ضامن تک کھلوا کر دیکھے تھے کہ کہیں ہم ان کے ملک میں چوری سے سوانتوں ہمگل نہیں کر رہے ہیں۔ ایک کشم عہدیدار نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کیا تمہارے ملک میں ابھی تک منی پر ایجاد نہیں ہوا ہے جو تم اس طرح رنگ برلنگے کپڑوں میں بندھی ریز گاری کو اپنے بازوں پر باندھے لے جا رہے ہو۔ ہمارے ہاں ریز گاری پر اس میں رکھی جاتی ہے۔ ایک اور کشم والے نے تو دنور تفتیش میں ہماری ہاتھوں کے اطراف بھی امام ضامنوں کو ڈھونڈنے کی سمجھی لاحاصل کی تھی اور بعد میں خاصاً اپوس ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان امام ضامنوں کا اصل مقصد اگر اپنی دولت کو پوشیدہ رکھنا ہے تو اس دولت پوشیدہ کی صحیح جگہ ناٹکیں ہیں بازوں نہیں کیونکہ پتلوں کا گھیر قمیص کی آستین کے گھیر سے نہ صرف بڑا اور محفوظ ہوتا ہے بلکہ سیف ڈیپاٹ لاکر کی دیشیت رکھتا ہے۔ جتنے چاہو باندھ لو۔ خیر جوبات بیت گئی اس کا ذکر کیا۔ ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ

ہمارا ذوق سفر اس وقت تک نہیں پڑھتا جب تک کہ ہمیں کوئی اذوقہ سفر نہ دے۔ اردو کے اکثر ادبیوں اور شاعروں کی طرح ہم بھی اب اعزازی زندگی گزارنے کے الٰہ ہو گئے ہیں یعنی دوسروں کے خرچ پر سفر کرنے کی عادت ہو گئی ہے بلکہ فرست کلاس کا کرایہ طلب کر کے ماشاء اللہ سینئنڈ کلاس میں بھی سفر کرنے لگے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ منزل مقصود پر ہم ہمیشہ فرست کلاس کے ڈبے سے ہی مر آمد ہوتے ہیں۔ ہم اس معاملہ میں ہم اپنے دوست مائل ہر ادا بادی کی طرح اتنے اصول پرست بھی نہیں ہیں کہ موصوف اپنے سکے بھتیجے کی شادی خانہ آبادی میں شرکت کے لئے گئے تو آنے جانے کے کرایہ کے علاوہ ہر اپڑھنے کا وہی معاوضہ لیا جو عموماً مشاعروں میں شرکت کی خاطر لیتے ہیں بلکہ ہرے کی طباعت کافر ضی مل اپنے فرمانبردار بھتیجے کی خدمت میں الگ سے پیش کیا۔ اس قدر رکڑ اصول پرست بنا اور ادب کی ایسی بے لوث خدمت کرنا ہمیں پسند نہیں۔ دنیا جانتی ہے اور ہمارا دل تو آج تک جانتا ہے کہ اپنی ہمیشہ کی شادی میں اپنے پڑھے کر گئے تھے۔ یہ ہمارا آخری سفری سبیل اللہ تھا۔

صاحبوا اب یہ جو ہم بر طانیہ جا رہے ہیں تو اپنی ہمیشہ کی شادی میں شرکت کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ ہمارے ذوق سفر کو اردو مجلس، بر طانیہ نے ہمیز لگائی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اردو مجلس بر طانیہ کے کارپوڑا زان پیر سر غلام زیدی، جناب عباس زیدی اور نقی تنویر (کہ تینوں حیدر آبادی ہیں اور وہاں کے نکالے ہوئے ہیں جہاں کے ہم بھی ہیں) کا ایک مشترک خط ہمیں وصول ہوا جس میں ادب میں ہمارے صحیح مقام و مرتبے وغیرہ سے خود ہمیں واقف کرانے اور ہماری ذات پرے بر کات کے بارے میں خاصی معلومات بہم پہنچانے کے بعد ہمیں مطلع کیا گیا تھا کہ بر طانیہ کے اردو والے مخدوم مجی الدین کو اکثریاد کرتے رہتے ہیں۔ اس بارہم ذرا جنم کر مخدوم کو یاد کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو بھی لگے ہاتھوں اس یاد میں شریک کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی معرفت حیدر آباد والوں کو بھی مخدوم کی یاد آئے اور اس طرح۔

اللہ ختم نہ ہو یا رغم گسار کی بات

اردو مجلس والوں نے آنے جانے کا لکٹ بھیجنے کے علاوہ ایک اضافی لاٹھی بھی دیا کہ میاں یہاں آؤ تو ”یادخدا مم“ کے طے کی صدارت بھی تمہیں سونپتے ہیں۔ پھر نہ کہنا نہیں خبر نہ ہوئی۔ ڈلن میں بھاگوں اب مخدوم کو یاد کرتا ہے اور کون ہم سے جلوں کی صدارت کرتا ہے۔ سواب ہم کسی حد تک مخدوم کو یاد کرنے اور بڑی حد تک ایک طے کی صدارت کرنے کے لئے بہ طائیہ جا رہے ہیں۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ ماضی میں بہ طائیہ جانے کے کئی موقع ہمارے ہاتھ آئے تھے مگر ہم نہیں گئے دو چار موقع تو ان کوں میز کافرنسوں کے تھے جن کا انعقاد آزادی ڈلن سے پہلے ہوا تھا اور جن میں ہم صرف اس تجسس کی خاطر شرکت کرنا چاہتے تھے کہ دیکھیں کوں میز کافرنفس کو صرف اس کی میز کی کولائی کی وجہ سے کوں میز کافرنفس کہا جانا ہے یا آزادی کو کوں کرنے کے سبب سے اسے کوں میز کافرنفس کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہم ان کوں میز کافرنسوں میں اس لئے نہیں گئے کہ اس وقت تک ہم نے پاؤں پاؤں چلنا بھی نہیں سیکھا تھا ورنہ ضرور چلے جاتے۔ انگریزوں کی بے جا محلت پسندی پر اب بھی دکھ ہوتا ہے کہ اگر وہ کچھ دن اور ہماری خاطر بد صیغہ میں بک جاتے تو گاندھی جی کی آواز پر ہم بھی لبیک کہہ کر تعلیم ترک کرتے اور اس طرح آج ہمارا شمار بھی بہ بنائے چالات، اکابرین میں ہونا اور ہم آج ہمیں تعلیم حاصل کر کے یوں جو تیار ہٹھاتے نہ پھرتے۔ بہ طائیہ جانے کا دوسرا موقع ہمیں اس وقت ملا تھا جب پُس چارلس کی شادی ہونے والی تھی۔ ہم بہت دنوں تک دعوت نامہ کا انتظار کرتے رہے وہ نہیں ملا۔ تب یقین آیا کہ بہ طائیہ میں بھی ڈاک کا انتظام ہمارے انتظام سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ ایسا کیونکر نہ ہو جب کہ ہمارے دوست شمس الرحمن فاروقی ہندوستانی ڈاک سے وابستہ ہیں اور بہ طائیہ کے محکمہ ڈاک میں ہمارے بھین کے دوست نقیٰ تنور کام کرتے ہیں۔

صاحب ایک زمانہ تھا جب اختر شیرانی ولیس سے آنے والے ہر آدمی سے یا ران ڈلن کا حال پوچھا کرتے تھے۔ اب ولیس سے جانے والا یا ران ڈلن کا حال سنانا ہے کیونکہ اکثر یا ران ڈلن

نے اب وطن سے بہت دور اپنی بستیاں بسائیں۔ حق تو یہ ہے کہ ہمارے بچپن کے سارے دوست بر طائفیہ میں اور نوجوانی کے دوست امریکہ میں خیریت سے ہیں، ان سے ذرا پختہ عمر کے دوست مشرق و سطحی کے ممالک یہی عروں کے تسلی اور اپنی زندگی کے تسلی کے خاتمے کا انتقال کر رہے ہیں۔ اس طرح ہمارا بچپن بر طائفیہ میں محل رہا ہے، ہماری نوجوانی امریکہ میں مہک رہی ہے اور ہمارا اوپر پر مشرق و سطحی میں اونٹھ رہا ہے۔ وطن میں تواب ہمیں اپنے بڑھاپے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کویا ہم بر طائفیہ میں جا رہے ہیں بلکہ اپنے بچپن کی طرف جا رہے ہیں۔

آیا یارانِ رفتہ آیا آیا

اس بچکانہ استدلال سے قطع نظر ہمارے دیر سے بر طائفیہ جانے کی کچھ اور معقول وجہات بھی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم اردو گزیدہ ہیں۔ ہر کام اردو کے حوالے سے کرتے ہیں۔ کسی کو دھوکہ بھی دینا ہوتا ہی شیریں زبان میں دیتے ہیں۔ یوں بھی دھوکہ دینے کے لئے اس سے بہتر زبان کوئی اور نہیں ہے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ بر طائفیہ کا اردو ماحدول ہمارے معیار تک رسائی حاصل کر لے اور جب وطن عزیز میں اردو کے ختم ہونے کا گمان اور بر طائفیہ میں اس زبان کے پہلنے پھولنے کا یقین پختہ ہو جائے تو ہب ہم سرزشیں فریگ پر قدم رنجفرما کیں۔ ماشاء اللہ بر طائفیہ میں اب اردو اور اردو پلچر کا خاصابول بالا ہے۔ پہلے دنوں بر طائفیہ کے ایک صاحب دہلی کی جامع مسجد کے سامنے ملے۔ کہنے لگے ”میاں! دہلی میں اب صرف جامع مسجد رہ گئی ہے۔ اس کی سیر ہیاں تو اب لندن میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کی نہاری اب بریڈ نورڈ میں ملتی ہے۔ یہاں کی کرخنداری اب بر ملکہم میں سنائی دیتی ہے۔“ تیر طائفیہ میں مقیم ایک حیدر آبادی دوست نے ہمیں کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا ”میاں! حیدر آبادی ہمیں اور حیدر آبادی نہاری کھانی ہو تو لندن آ جاؤ۔ اس ہمیں کی تلاش میں پتھر گئی اور مچھلی کمان کے چکر کیوں لگاتے ہو۔ مچھلی کمان تو اب لندن میں آگئی ہے۔“ ہمیں انگریزوں پر غصہ بھی آتا ہے کہ اول تو ہمارا کوہ نور ہمیں واپس نہیں کرتے اور پر سے جامع مسجد کی سیر ہیاں بھی وہیں منگوایں۔ کوہ نور تو خیر ہمیں واپس کر دیں البتہ جامع مسجد کی سیر ہمیں کو

وہیں رہنے دیں کہ یہاں زیادہ محفوظ ہیں۔

سنا ہے کہ لندن میں اب آل الکلینڈ مشاعرہ بھی منعقد ہوتے ہیں۔ مقامی شاعروں اور بیرونی شاعروں کا چکر بھی وہاں چلتا ہے۔ اب انگلستان کے شاعروں کا موازنہ انس و دیور اور معز کے، انشاء و صحافی بھی ہونے لگا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ اردو ادب میں پہنچ کی بھی تو باقی ہیں۔ پچھلے دنوں وطی میں ہماری ملاقات بہ طائیہ کے ایک اردو شاعر ریاض بر ملکھموی سے ہوئی تھی۔ دو گھنٹوں تک اپنا کلام والا بہت نظام ہمارے کوش گزار کرنے کے بعد اپنے دو بہ طائی شاعر دوستوں فیض بر یڈ فورڈی اور آتش لیک ڈسٹرکٹوی کے مجموعہ ہائے کلام کے اعزازی نئے بھی ہمیں سوچنے اور خواہش کی ہے کہ ہم اپنی زریں رائے سے انہیں مطلع فرمائیں۔

خوب یاد آیا ہمارے دوست خلیق اثتم نے کہ جو انجمنِ ترقی اردو کے حزل سکریٹری ہیں اور ابھی انگلستان سے واپس ہونے ہیں ایک محفل میں یہ مژدہ جانفرز ابھی سنایا تھا کہ بہ طائیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اگر بہ طائیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے تو انگریز بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے اسکول کہاں سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ جب سے یہ نہ ہے ہمیں انگریزی زبان سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ خلیق اثتم جنہیں ہم انجمنِ ترقی اردو کی رعایت سے ”خلیق انجمن“ بھی کہتے ہیں اردو کے تعلق سے بڑا رجائی تصور رکھتے ہیں اور ہندوستان کے باہر اس کے مستقبل سے خاص سے پر امید ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اردو کی صورت حال کو مزید پر امید ثابت کرنے کے لئے بہ طائیہ کے اردو اسکولوں کی صحیح تعداد بتانے میں تھوڑے بہت مبالغہ سے کام لیا ہو لیکن اتنا اعتبار تو ہم ان کے دعویٰ پر کریں سکتے ہیں کہ بھلے ہی بہ طائیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اردو نہ پڑھائی جاتی ہوائی (۸۰) اسکولوں میں تو ضرور پڑھائی جاتی ہوگی۔ کبھی کبھی تقریر میں بھی تو ”کتابت کی غلطی“ ہو جاتی ہے۔

اردو سے قطع نظر بہ طائیہ جانے کی اور بھی کئی وجہات ہیں۔ ہمیں لندن کی ان تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کی تمنا ہے جہاں بیٹھ کر انگریزوں نے اپنی تاریخ تو بنائی گردے اور اس کا جغرافیہ

بگارا۔ ہمیں ان عمارتوں کے علاوہ اردو مزاج ٹگاری کے قطب بینار کو بھی دیکھنا ہے جو ان دونوں لندن میں واقع ہے۔ ہماری مراد حضرت مشتاق احمد یوسفی سے ہے۔ اس عمارت کا موجودہ حال بھی آپ کو لکھ کر بھیجیں گے۔ پیر سر غلام زیدی اور عباس زیدی تو خیر ہمارے میزبان ہیں یعنی جن کی ”اردو مجلس“ کا حال آپ اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ لندن میں ہمارے بھائیں کے کئی احباب رہتے ہیں۔ نقیٰ تنویر جو ہمارے ہمراز اور بھی ہم ان کے ہمراز ہوا کرتے تھے پچھلے باہمیں برس سے لندن میں مقیم ہیں لیکن ہر دم رگ جاں سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ وقار لطیف ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے باوجود انگریزوں کی طرح رہتے تھے۔ انگریزی ان کا اوڑھنا پچھوٹھی۔ انگریزی میں بولتے تھے تو لگتا تھا کہ بی بی سے خبریں شرکر ہے ہیں۔ آدمی گالیاں عموماً اپنی ماوری زبان میں دیتا ہے۔ یہ گالیاں تک انگریزی میں دیتے تھے۔ جن کا بعد میں ہمیں کسی سے ترجمہ کروانا پڑتا تھا۔ انگریزی کی بہت سی گالیاں ہم نے انہیں سے پکھیں۔ خاصی بے ضرر گالیاں ہیں جن سے اس زبان کا جس میں کہ پیدی جاری ہوں اور اس شخص کا جس کو پیدی جاری ہوں کچھ بھی نہیں گزنا۔

ہمارے دوست حسن عسکری ہیں جن کے جانے سے ہندوستان میں جیکسی ڈرانیوروں کا کاروبار خاصاً متاثر ہوا ہے۔ مشہور تھا کہ وہ اپنے ڈرانگ روم سے اپنے ہی گھر کے باتھر روم میں بھی جیکسی میں بیندھ کر جاتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ اپنی باتوں سے علم کا دریا کچھ اس زور سے بہاتے تھے کہ ہم تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔

ڈاکٹر یوسف علی خاں اب خیر سے لندن میں ہیں جنہوں نے اردو فریجیہ تعلیم میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مریض اگر اپنے مرض کی کیفیت شناسناہی اور بامحاورہ اردو میں بتانے سے قاصر ہوئا تو اس کا علاج نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے جب حیدر آباد میں اپنا مطب کھولا تو بشمول ہمارے تین چار اور دوستوں کو اس کام پر مأمور کیا تھا کہ ہم ان کے مطب میں آ کر بطور مریض بیٹھا کر یہ تاکہ عوام الناس کو پڑھے چلے کہ ان کے ہاں خاصے مریض آتے ہیں۔ بطور مریض ہماری مستقل

موجودگی سے اگر چہ ان کے مطب کی رونق میں خاصاً اضافہ ہو جاتا تھا مگر بعد میں لوگوں نے یہ کہتا شروع کر دیا تھا کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفائیں ہیں ہے کیونکہ پچھلے چار میزینوں سے چار مریض ہر روز پابندی سے ان کے مطب پر آتے ہیں لیکن اتنے لمبے علاج کے باوجود ان کے صحت یا بہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے بعد یوسف نے ہمیں مریض کے عہدہ سے بر طرف کر دیا تھا۔ حبیب حیدر آبادی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ انہیں یاد ہو کر نہ یاد ہو آج سے تمیں برس پہلے ہم ان کی سوڈائیں کی دکان پر یعنی پینے اور انہیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ وہ دکان اپنی بڑھ گئے تو ہم نے بھی یعنی پیارا ترک کر دیا۔

اکبر حیدر آبادی بھی آسفورڈ میں بیٹھ کر شعر کہتے ہیں اور اتنے لمبے قابلے کے باوجود اپنے شعروں سے دلی میں ہمارا سر و حنواتے ہیں۔ مشہور محقق اور ماہر آثار قدیمه ڈاکٹر ضیاء الدین شنگیب بھی اکثر یاد آتے ہیں جنہوں نے غالب کو "حیدر آبادیا نے" کے لئے اقبال اور کوئئی کی طرز پر ایک باضابطہ کتاب " غالب اور حیدر آباد" لکھی تھی۔ وہ جب سے ہندوستان سے گئے ہیں آثار قدیمه میں ہماری وجہ پر ختم ہو گئی ہے۔

ان حیدر آبادی احباب کے علاوہ کچھ پیارے غیر حیدر آبادی دوست بھی ہیں جن سے ملنے کو ول مچلتا ہے۔ ایک تو ہمارے کرم فرما ساقی فاروقی ہیں جن سے دس سال پہلے دلی میں ملاتات ہوئی تھی۔ اس قدر رٹوٹ کر ملتے ہیں کہ ملنے والا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ ان کی شاعری ہمیں بہت پسند ہے کیونکہ ان کی شاعری کو پڑھنے کے بعد آدمی کو چڑیا گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اپنے کئی احباب کی زبانی ان کے کچھوؤں اور بگیوں کی بھی بہت شہرت سنی ہے۔ اب ان کا دیوار بھی کریں گے۔ ان کے کئی مینڈک دلی میں آباد ہیں، ہم بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ ساقی فاروقی دو تین برسوں میں ایک بار اپنی جڑوں کی تاش میں ہندوستان آتے ہیں۔ انہیں جڑیں ملتی ہیں یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے البتہ ہندوستان میں ان کے ساتھ کچھ جڑی بولیوں کو ہم نے ضرور دیکھا ہے۔

انتخار عارف سے اگرچہ پہلے سال دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس محبت سے ملے کہ اس کی گری سے اب تک ہمارا دل پھلتا ہے۔ اردو مرکز بر طائیہ کے سکریٹری ہیں۔ خوب صورت شعر کہتے ہیں اور ہمیں پیارے پیارے سخط لکھتے ہیں۔ احمد فراز، سحاب ترزاش، زہرہ نگاہ، رضا طلبی عابدی، چاند کرن، سوہن رہی، راج کھیتی، دھرم پال، مجیب صدیقی اور شمس الدین آغا ان سب سے ہم جلد ہی میں گے۔ اس ذہن پس منظر کے ساتھ ہم بر طائیہ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم اور ہمارے دل پر جو کچھ گزرتی رہے گی اسے رقم کر کے بھیجنے رہیں گے۔



سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی جہاز میں

تاریخ کرام اہم دلیل سے اذکر خلا میں آگئے ہیں اور ہر ہوائی سفر کی طرح اس بار بھی ہمیں کھڑکی کے بہادر والی نشست ملی ہے۔ کچھ دیرتا تک جھائک کرتے رہے کہ اس کی پرانی عادت ہے۔ جو عادت کے جاتے جاتے یا ہمارے جاتے جاتے ہی جائے گی۔ پالم کا ہوائی اڈا اب دو گھنٹے پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم اب شاید وطن عزیز کی وہر تی سے بھی باہر نکل چکے ہیں۔ یقیناً جانے کون سامنک ہے جس کی فضاؤں میں ہم اڑ رہے ہیں سکا ش کہ ہم کوئی اہم شخصیت ہوتے اور اس ملک کی فضاؤں میں سے گذرتے ہوئے یہاں کے بائیوں کیلئے خیر سگالی، محبت اور عالمی اس غیرہ کے پیغام روانہ کرتے۔ بخلے ہی کسی کو ہمارے چذبہ خیر سگالی کی ضرورت نہ ہو لیکن یہی تو وہ واحد چذبہ ہے جو حضرت جگہ مراد آبادی کے بعد ہمارے پاس وافر مقدار میں موجود ہے۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

آدمی ایک بار بھروسی سفر پر ہو آئے تو پھر ہوشیار ہو جانا ہے۔ ہمارا تین سال پر آنا تجربہ بالآخر ہمارے کام آ رہا ہے۔ چنانچہ اس بار دلیل کے ہوائی اڈے پر صرف تین چھروں نے ہمیں وداع کیا۔ ہمارے حیدر آبادی دوست بشارت اللہ حسینی تھے کہ جنہیں ہمیں نہ صرف ہوائی جہازوں پر بلکہ ٹرینوں اور بسوں پر بھی وداع کرنے کا تجربہ ہے۔ اس وسیع تجربہ کے بعد وہ بھلا ہمیں خوشی خوشی وداع کرنے کیوں نہ آتے۔ ہمارے نوجوان دوست عزیزی خی حسن صدیقی بھی ہمیں رخصت کرنے کم آئے تھے اور ہم سے پہنچنے زیادہ آئے تھے کہ ہم دورہ یورپ و امریکہ سے فارغ ہونے کے بعد ان کے وطن مالوف اہر وہہ کا دورہ کریں گے۔ اگر چہ ہم نے ہاں کر دی ہے مگر انہیں کیا بتائیں کہ اہر وہہ کا دورہ کرنے سے پہلے ہمیں مغرب کے کئی قاتلوں کو اپنے قدومہ میمت لزوم سے نوازا ہے۔ ہماری نصف بہتر بھی اس بارہمیں باویڈ ہم وداع

کرنے کے لئے آئی تھیں۔ اس باران کی آنکھوں میں ہماری ”انگریزی والی“ کے باعث زیادہ ہی آنسو تھے۔ کہہ رہی تھیں کہ جب تم جاپاں گئے تھے تو مجھے یقین قاکہ تمہیں جاپانی نہیں آتی۔ نساو کی اصل جڑ تو زبان والی ہی ہوتی ہے۔ زبان یا رترکی ہو اور تم ترکی نہ جانو تو قیل منڈھنے نہیں چاہتی۔ لیکن اب کی باری میرا سکون قلب اس لئے متزل ہے کہ تم جن ملکوں میں جا رہے ہو وہاں انگریزی بولی اور بھجی جاتی ہے اور تم انگریزی نہ صرف بولتے ہو بلکہ سمجھتے بھی ہو۔ یا ے اللہ کیا کروں۔“

اب ہم انہیں کس طرح سمجھائیں اور کس زبان سے سمجھائیں کہ انگریزی جانتے کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ انگریزی بولنے کے لیجھ کو سمجھنے کی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہم جس ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں اس میں بڑی دیر سے کچھ اعلانات ہو رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ چونکہ سیرین عرب ائیر لائنس کا طیارہ ہے اس لئے عربی میں اعلانات ہو رہے ہوں گے۔ ہم نے عربوں کی اپنی زبان سے محبت کی تعریف اپنے ساتھی مسافر سے کی تو اس نے کہا ”بندہ نوازا آپ کو خوش نہیں ہوئی ہے۔ یہ اعلانات انگریزی میں ہی ہو رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس انگریزی پر عربی لیجھ کا کلف چڑھایا جا رہا ہے۔ اس کا کلف ہٹا رینے تو آپ کو انگریزی سنائی دے گی۔“ ہم نے بڑی دیر تک عربی لیجھ کے کلف کو ہٹانے کی سنجیدگی سے کوشش بھی کی مگر کچھ سمجھنے میں نہ آیا۔ ایک لفظ البتہ ہماری سمجھتے میں آیا اور وہ ہے ”شارجه۔“ قیاس اٹلب ہے کہ ہمارا ہوائی جہاز شارجه کی سمت جا رہا ہے۔ کہیں بھی جائے ہمیں ایک نہ ایک دن لندن ضرور پہنچاؤ دے۔ ہمیں بھی دعا ہے۔

صاحبہ سیرین عرب ائیر لائنس کے طیارے میں ہم پہلی بار سفر کر رہے ہیں۔ اس کی جو کچھ بھی شہرت سے تھی طیارے میں بیٹھنے کے بعد درست ثابت ہو رہی ہے۔ ماشاء اللہ خاصاً شرگی طیارہ ہے۔ زیادہ تر بد ابتدی عربی زبان میں ہی درج ہیں۔ ہماری نشست کے سامنے ایک عبارت عربی میں درج ہے ”قیص انجات تحت المقدس۔“ خاصاً وقت اس عبارت کے مطلب کو سمجھنے میں ضائع ہو گیا۔ چونکہ اردو کی معرفت تھوڑے بہت عربی الفاظ بھی جانتے ہیں اس لئے جیسے قیسے اس

عبارت کا مطلب نکال لیا ہے۔ بھر لاف کی بات یہ ہے کہ اس چار لفظی عبارت میں جو چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ سب کے سب اردو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ساری گزبردی عربی کے ”آل“ کی وجہ سے ہو گئی۔ اس عبارت کا اردو میں لفظی ترجمہ تو شاید مناسب نہ ہو گا۔ تاہم آپ کی سہولت کے لئے بتاتے چلیں کہ انگریزی میں اس کا ترجمہ Life jacket under your seat (Life jacket under your seat.) ہو گا۔ اس ترجمہ کو پڑھ کر آپ عربوں کی راست کوئی کہتا نہیں گے۔ ایک اور خصوصیت ہمیں اس ہوائی جہاز کی یہ نظر آتی کہ خاص امر دانہ ہوائی جہاز ہے کیونکہ اس میں ایک ہوش قسم کی مخلوق ذرا کم عی پائی جاتی ہے۔ خطرے کے وقت ہوائی جہاز سے باہر کو نہ اور آسیجن کی مدد سے تنفس کو برقرار رکھنے کا عملی مظاہرہ بھی مردوں نے انجام دیا۔ ہوائی حسیناً ہمیں جب بھی اس طرح کے عملی مظاہرے کرتی ہیں تو تب بھی ہمیں خطرہ کی صورت میں ہوائی جہاز سے باہر نکلنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم یہ عملی مظاہرہ آنکھوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔ ان کی وجہ سے سیرین عرب ایک لائنس کے پہلوان نما اسٹیورڈس نے یہ عملی مظاہرہ کیا۔ کھانا بھی ان ہی لوگوں نے اپنے کرخت ہاتھوں سے کھایا۔ دو تین خواتین طیارے میں ضرور نظر آئیں مگر وہ سکھر زیبیوں کی طرح اپنا زیادہ وقت باور پھی خانہ میں گزارتی نظر آئیں۔ مسکراہٹ بھی ان کے چہروں پر بالکل دکھائی نہ دی۔ غالباً عربی میں مسکراہٹ تھیں۔ اے کاش ہم بھی عربی جانتے تو ان کی مسکراہٹ کو سمجھتے۔

اس بار یورپ کا سفر ہم خاصے اطمینان کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس سفر میں ہمارے ساتھ دوستوں کی فرمانشوں کی لمبی نہر تھیں نہیں ہیں۔ تین سال پہلے ٹوکیو میں ہمارے حالات تو خیر اچھے رہے مگر حالت کچھ ایسی رہی کہ کسی بھی دوست کی فرمانش کی تکمیل نہ کر سکے۔ اس وقت تو ہمیں اور ہمارے احباب دنوں کو خاصاً ڈش صدمہ پہنچا مگر اس کا ایک قائدہ یہ ہوا کہ اس بار کسی دوست نے فرمانشوں کی نہرست نہیں دی۔ ہم نے مر ڈھا اپنے دوست بدرج ورمائے پوچھا بھی کہ بتائیے اس بار آپ کے لئے یورپ سے کیا لے آئیں۔ بولے ”میں نے تمہیں جو دو گرم سوٹ دینے تھے انہیں واپس لیتے آں۔ بھولنا مت۔ بڑا احسان ہو گا۔“ ہمارے بزرگ

دوست بناڑی لال شرما کہ ہمارے کرم فرماؤں میں سے ہیں ہمیں دواع کرنے کے لئے آئے تو ہم نے ان سے بھی بھی سول پوچھا۔ بڑی متاثر کے ساتھ بولے ”کیوں تکلف میں پڑتے ہو۔ پھر بھی تمہارا اصرار ہے تو میری ایک فرمائش یہ ہے کہ میں نے تمہیں جو سوت کیس دیا ہے اسے بحفاظت تمام واپس لیتے آتا۔“ بہر حال اس بار وہ ستوں کے دینے ہوئے سامان سفر سے لدے پھندے ہم پوری بے فکری کے ساتھ یوروب پ جا رہے ہیں۔ اگر یہ سامان چوری بھی ہو جائے تو ہمیں کوئی فکر نہیں کہ یہ ہمارا ذائقی سامان نہیں ہے۔

رہا کٹکانہ چوری کا دعا دیتے ہیں رہزن کو

لیجئے صاحب! ہمارا قیاس بالکل صحیح نکلا اور ہم صحیح شارجہ کے ہوائی اڈہ پر اتنے والے ہیں، آسمان کی بلند پوں سے نیچے جھانکتے ہیں تو ہر طرف صحرائی صحرادکھائی دیتا ہے۔ اس صحرائیں شارجہ نہ جانے کیا کر رہا ہے مگر ہمیں شارجہ سے کیا لینا دینا ہے۔ سافر ہیں و مکڑی رک کر آگے کو نکل جائیں گے۔ ہم نے ہمت کر کے ایک شامی اسمیورڈ کو بلایا۔ اس کی انگریزی پر سے عربی کے کلف کو اتنا را۔ جتنا کلف اتنا اس سے بھی پتہ چلا کہ ہم شارجہ میں کچھ دیر تھکلی لے کر مشق جائیں گے۔ مشق میں ذرا لمبی تھکلی لیں گے پھر معابدہ میونخ والے میونخ سے ذرا سی چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے لندن جا اتیں گے۔

شارجہ کا ہوائی اڈہ آپکا ہے۔ دور سے اس کی بناوٹ کچھ ایسی نظر آتی ہے کہ اس پر ہم کو ہمارے ہاں کے کسی بزرگ کی درگاہ کا گمان ہوتا ہے۔ بڑی بڑی پر شکوہ گنبدیں اور اونچے اونچے جلیل القدر بینار۔ ہم تو خیر نہ اڑ گئے تھے کہ یہ ہوائی اڈہ ہے مگر ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ایک باریش ہندوستانی بزرگ نے فوراً اپنے سر پر رومال رکھ لیا اور لگنے فاتحہ پڑھنے۔ ان کے بیٹھنے کے خاصہ جہاں دیدہ نظر آتا ہے انھیں منع کرنے کی کوشش بھی کی مگر اس کے منع کرتے کرتے بھی بڑے میاں اپنے جوش ایمانی کے زیر بذریعہ ہوائی اڈہ پر فاتحہ پڑھے بغیر نہ رہ سکے۔

صاحب اگلا حال لندن پہنچ کر عی لکھیں گے۔



لندن میں ہمیں دفن

کرنے کی تیاریاں

صاحب اکون کہتا ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ یہ سب جھوٹ ہے فربہ ہے۔ تین سال پہلے ٹوکیو جاتے وقت ہماری زندگی کے تقریباً چار گھنٹے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ رات کے تین بجے دہلی سے چلے تھے تو ایک گھنٹہ بعد مرغ کی باہمگ تو نہیں سنائی وی تھی البتہ سورج سمندر میں سے نکل آیا تھا۔ ہماری گھری میں ہندوستان میں دن کا ڈریٹھ بجا تھا تو ٹوکیو پہنچتے پہنچتے اندر ہمرا ہو گیا تھا۔ اس وقت سے ہمیں اپنی عمر عزیز کے چار تین گھنٹوں کے خالع ہونے کا تلق تھا۔ اب تین سال بعد لندن گئے تو ہمیں اپنا کھویا ہوا تیمتی وقت واپس مل گیا۔ ہم صبح نوبجے دہلی سے چلے تھے۔ شارچہ میں کچھ دیر رک کر دشمن پہنچ تو سورج تب بھی سوانیزے پر تھا۔ دشمن سے میونخ کی جانب روانہ ہوئے تو تب بھی سورج آن بان کے ساتھ چمک رہا تھا بلکہ میونخ کے آتے تو عجب ہاں تھا۔ بیچارا سورج غروب ہونے کے لئے بے چین تھا اور ہمارا طیارہ اسے ”شرف غروبیت“ عطا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بڑی دیر تک سورج اور طیارہ میں آنکھ چھوٹی جاری رہی۔ مگر سورج بالآخر سورج ہے۔ ہمارا طیارہ میونخ کے ہوائی اڈے پر اتر اتو سورج نے ہمینان کا البا سافس لیا اور غرڈاپ سے غروب ہو گیا۔ پھر جب ہم میونخ سے چل کر لندن کے ہوائی اڈے پر اترے تو ہماری گھری میں ہندوستانی وقت کے مطابق رات کا ڈریٹھ بجا تھا اور لندن کی گھریوں کو ابھی رات کے نو (۹) بجانے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ تین سال بعد ہمیں اپنا کھویا ہوا وقت نہ صرف واپس مل گیا بلکہ نفع میں ایک فاضل گھنٹہ بھی مل گیا۔ اب ہم ان پانچ قاتلوں گھنٹوں میں اردو

کی کچھ اور بھی خدمت کریں گے۔ اردو والے ہٹیا رہ جائیں۔

لندن کے ہتھروائیر پورٹ پر اتر نے سے پہلے ہم پر یوں بھی کچھ عجیب سی ہمیت طاری تھی کیونکہ ہم اس ملک میں قدم رنج فرمائی ہے تھے جہاں کے شکر، درڈ سورجھ، بائیرن، شلی، کیش، ڈنیس، برمارڈشا اور بہت سے دوسرے ادیب، جن کے نام ہمیں لی اخال یا دنیہ آرہے ہیں، کی وحاشی ہم پر بچپن سے بیٹھی ہوئی ہے۔ ہتھرو کے صاف سترے ایئر پورٹ پر اتر کر ہم امیگریشن کی لائی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ ہم سے اگلے مسافروں سے طرح طرح کے سوالات پوچھنے جا رہے تھے کہ لندن کیوں آرہے ہو؟ کسی اور جگہ کیوں نہیں گئے؟ ”کب تک قیام کا ارادہ ہے؟“ لندن میں قیام کے اخراجات کون بیوقوف برداشت کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ امیگریشن کے کئی عہدیدار بھگلتاتا ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارے حصہ میں آنے والا امیگریشن عہدیدار خود بھی مزاح نگار ہوگا۔ اس نے ہمارا پاسپورٹ و یکھنے کے بعد ہم سے لندن آنے کی غرض و غایبیت پوچھی۔ ہم نے کہا ”اردو مجلس (برطانیہ) کی دعوت پر لندن آئے ہیں۔ جلوں وغیرہ کی صدارت کریں گے۔ کچھ اپنی سنائیں گے کچھ آپ کی نیں گے اور اپنے ملک کو واپس چلے جائیں گے۔ یہاں اردو مجلس کا دعوت نامہ۔“ اس نے دعوت نامے کو غور سے دیکھ کر کہا ”یہ اردو مجلس کیا ہے؟“ کہا ”لندن کے اردو بولنے والوں کی ایک تنظیم ہے۔“

پوچھا ”اردو سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“

ہم نے طنز پہنسی ہستے ہوئے کہا ”تعلق کی بھی خوب رہی۔ سہیاں اس زبان کے مایا زادیب ہیں اور ساری زندگی اس زبان کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ اب آپ کے ملک میں بھی تھوڑی سی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔“

پوچھا ”آپ اور ہمارے ملک میں آئیں گے تو اُھر آپ کے ملک میں اردو کی خدمت کون

انجام دے گا؟“

ہم نے کہا ”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ وہ سو برس تک آپ ہماری فکر کر کے دلبے ہوتے رہے۔ یوں بھی ہمارے ملک میں وہ بارہ ہزار انسانہ نگار اور لاکھ ڈبڑھلا کھشا عرض پہلے ہی سے اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم اور ہر آجائیں گے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔“ اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا ”یہ بتائیں آپ کتنے عرصے تک لندن میں اردو کی خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

ہم نے کہا ”بھی کوئی ایک مہینہ تک آپ کے ملک میں اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔“ پوچھا ”ایک مہینہ تک آپ لندن میں اس زبان کی خدمت کریں گے تو کیا اتنی خدمت اس زبان کے لئے کافی ہوگی۔ لگتا ہے آپ بہت زیادہ خدمت انعام دیتے ہیں۔“

ہم نے کہا ”ذرہ نوازی کا شکریہ۔ لیکن ہمیں لندن میں بہت زیادہ خدمت انعام دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ کے ملک میں بھی کم از کم ہزار ڈبڑھ ہزار انسانہ نگار اور پانچ چھ ہزار شاعر اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔“

اس نے پس کر کہا ”جب اس زبان کے اتنے سارے خدمت گزار خود بر طائفیہ میں موجود ہیں تو آپ نے یہاں آنے کا تکلف کیوں کیا؟“

اس کے اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر ہمیں تشویش ہونے لگی۔ ہمیں لگا کہ اس کی نیت اچھی نہیں ہے اور ہمیں اپنے ملک میں آنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔ لہذا ہم نے آخری حرہ کے طور پر اپنے دوست نقی تنویر کا وہ حلفیہ بیان پیش کر دیا جس کے بارے میں نقی تنویر نے ہمیں لکھا تھا کہ اگر اردو مجلس کے دعوت نامے کی بنیاد پر ایمگریشن والے تمہیں ویزا دیجئے میں ہال مٹول کریں تو میرا یہ حلف نامہ ان کی خدمت میں پیش کر دینا۔ اس حلف نامے کی رو سے لندن میں تمہارے قیام اور تمہاری ذات سے متعلق سارے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی ہے۔ ہم اپنے دوستوں کے بیان پر چاہے ہی گیوں نہ ہو ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر

لیتے ہیں۔ چنانچہ خود ہم نے اس بیان کو پہلے سے نہیں پڑھا تھا۔ عہدیدار مذکور اس حلف نامے کو پہلے غور سے پڑھتا رہا پھر بولا ”آپ بھی عجیب آدمی ہیں اور لوگ تو لندن میں آباد ہونے کے ارادے سے آتے ہیں اور آپ یہاں بہ نفس فیض آکر دن ہوا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے ملک میں دُن ہونے کی سہولت بھی نہیں ہے؟“

ہم نے انکھیں پھاڑ کر کہا ”نحو ذ بال اللہ! ہم آپ کے ملک میں کیوں دُن ہونے چلیں۔ دُن ہونے کے لئے ہمارے ملک سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ آپ نے ہمارے عالیشان مقبرے نہیں دیکھے کہ کس اہتمام سے مردے کو دُن کیا جانا ہے۔ تسبیح تو آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ویسے کفن دُن والا آپ کا سول ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔“

اس نے نقیٰ تنور کا حلف نامہ ہماری طرف پڑھاتے ہوئے کہا ”آپ نے اپنے دوست کا حلف نامہ غالباً نہیں پڑھا ہے۔ اگر پڑھ لیتے تو لندن نہ آتے۔ آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ تب ہمارا سوال آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔“

اب جو ہم نے حلف نامہ کو پڑھنا شروع کیا تو ہماری انکھوں کے آگے اندر ہیرا چھانے لگا۔ نقیٰ تنور کے حلف نامے کا متن کچھ اس طرح تھا، ”میں نقیٰ تنور پہ تائی ہوش و حواس اپنا یہ حلقویہ بیان قلمبند کرتا ہوں کیمیرے دوست مجتبی حسین کے لندن میں قیام کے سارے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گی۔ میں مزید یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر لندن میں مجتبی حسین کا انتقال ہو جائے تو میں یا تو ان کی نعش کو ہندوستان روانہ کرنے کا بندوبست کروں گا یا پھر بر طانیہ میں ہی کسی موزوں جگہ پر ان کی مدفین کا انتظام کروں گا۔ اور یہ سارے اخراجات میں خود برداشت کروں گا۔“

امیگریشن عہدیدار نے ہمارے چہرے پر خوف اور پریشانی کے آثار کو بھانپ کر کہا ”مسٹر حسین! آپ کے دوست کی نیت اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ اب بھی لندن شہر میں جانے کی اجازت لیما چاہیں گے یا واپسی کا ارادہ ہے؟“

ہم نے پیشائی سے پہنچنے پوچھتے ہوئے کہا ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ان دونوں دوست اور دشمن میں تمیز کرنا بہت دشوار ہے۔ یہ ذات شریف میرے بھین کے دوست ہیں اور ذرا وادیکھنے کے میرے تعلق سے ان کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔ ویسے اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ مجھے دینا دیں یا نہ دیں۔“ امیگر یعنی عہد پیدار نے بنس کر کہا ”اب تو آپ کو دینا ضرور دوں گا۔ یہ میری مجبوری ہے کیونکہ آپ تو مر کر بھی ہر طالبی کا کچھ بگاڑنا نہیں چاہتے۔“ اس نے دھڑ سے پاسپورٹ پرویزا کی ہبہ لگادی پھر آنکھ مار کر بولا ”مسن حسین! ایک بات یاد رکھئے۔ اگر آپ کا دوست کسی کو دُن کرنا چاہتا ہے تو میری یہ خواہش ہے کہ وہ آپ کو دُن نہ کرے بلکہ اردو کو دُن کر دے کیونکہ اردو کو دُن کرنے یا اس کی نقش کو ہندوستان رو انہ کرنے میں احتی اخراجات نہیں آئیں گے جتنے کہ آپ کو یہاں دُن کرنے میں آئیں گے۔ میں تو آپ کے اور آپ کے دوست کے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔“

ہم اپنا پاسپورٹ لے کر بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل گئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم لپٹنے کندھوں پر خود اپنی نقش کو اٹھانے جا رہے ہیں۔ سامان واپس کرنے والے بیٹ پر جا کر اپنا سامان اٹھایا۔ پھر خود کار راست پر سامان سمیت اپنی میت کو جتن سے کھڑا کیا اور آگے کو نکل گئے۔ دو ایک جگہ جیتھرہ ایسپورٹ پر اردو میں بھی مسافروں کے لئے ضروری ہدایات نظر آئیں کہ ایسپورٹ صاف سفر کرنے یعنی سگریٹ کے نکھرے نہ پھینکو، موچنگ پھلی کے چھلکنے نہ بکھراو۔ بہادر کرم اپنا تھوک اپنے منہ عی میں رکھو وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہماری ڈنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ جیتھرہ ایسپورٹ پر اردو عبارت کو پڑھ کر وہ والہانہ صرفت حاصل نہ ہوتی جو خود ہندوستان میں بھی اردو عبارت کے نظر آجائے پر حاصل ہوتی ہے۔ یوں بھی صفائی سے متعلق اردو میں اس عبارت کو درج کرنے کا مقصد اردو کی اہمیت کو تسلیم کرنا نہیں تھا بلکہ اس طرح صفائی کے تعلق سے اردو والوں کی شہرہ آفاق عادات و اطوار کو دنیا والوں پر اجاگر کرنا تھا ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس غیر ضروری ہدایت کو چھوڑ کر بقیہ ساری ضروری ہدایتیں اردو میں درج نہیں تھیں۔

بیتھرو ائر پورٹ پر بدلیات آتی واضح ہوتی ہیں کہ کوئی مسافر راستہ بھٹکنا چاہے تو تباہی بھٹک نہیں سکتا۔ یہاں بھٹکنے کے لئے بہت محنت اور جگتو کرنا پڑتی ہے۔ یوں بھی ہمیں پتہ تھا کہ یہ سارے راستے ہمیں مقل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ تبھی تو یہ اہتمام ہے۔ ہمدرالی پر اپنا سامان رکھے کشم کمحلہ سے باہر نکل آئے تو دیکھا کہ نقی تنور ریٹک سے لگے کھڑے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے ان کی باچھیں محل اٹھیں اور ہم نے فل میں سوچا کہ ذرا دیکھو تو ظالم کو ہمیں فتن کرنے کی کتنی صرتہ ہے۔ ہم باہر آئے تو نقی ہم سے بغلگیر ہونے کے لئے ہتنا آگے بڑھتے تھے اتنا ہی ہم پیچھے بٹتے جاتے تھے۔ ہم اصل میں یہاں میناں کر لیا چاہتے تھے کہ کہیں نقی کے ہاتھ میں چھری چاقو تو نہیں ہے۔ بارے بغلگیری کا مرحلہ طئے ہوا تو نقی نے کہا ”بہت اوس اور عذر حال دکھائی دیتے ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

ہم نے کہا ”ویسے تو سارے سفر میں چاق و چوبندر ہے۔ بھی ابھی تمہارے بیتھرو ائر پورٹ پر آتے اور ایگریشن عہدیدار سے بات کرنے کے بعد ہماری یہ حالت ہو گئی ہے۔“

نقی نے کہا ”ایگریشن والوں نے تمہیں سمجھ تو نہیں کیا؟“

ہم نے کہا ”ایگریشن عہدیدار تو بہت بھلا آدمی تھا۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں شکایت تو ہیشہ اپنوں ہی سے ہوتی ہے۔ خیراں مسئلہ پر بعد میں بات کریں گے۔“

نقی نے کہا ”آخر بات کیا ہوئی، یہ تو بتاؤ؟“

ہم نے کہا ”ہمیں فوراً اس جگہ لے چلو جہاں تم نے ہمارے قیام کا بندوبست کیا ہے۔ اس وقت ہماری جذباتی اور نفیتی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ تہائی میں کچھ دیر غور کرنا چاہتے ہیں۔ یوں بھی سولہ گھنٹہ کا سفر کر جکے ہیں۔“

نقی نے کہا ”فوراً چلنا تو ناممکن ہے کیونکہ تمہارا طیارہ مقررہ وقت سے پچھیں منت پہنچے ہیں لندن پہنچ گیا ہے اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکریب نے مجھ سے مددہ کیا تھا کہ وہ بھی تمہیں رسیو کرنے کے لئے آئیں گے۔ وہاں آنارقدیمہ ہیں۔ اپنے ملت پر آئیں گے۔ ان کا انتظار کرنا ضروری ہے۔“

ہم نے دل میں سوچا تی کتنا خطرناک آدمی ہے۔ ایک ماہر آثار قدیمه کو بھی شریک جنم کرا چاہتا ہے۔

امتنے میں ڈاکٹر شکیب آگئے تو ہم نے انہیں جیسے تیسے رسیو کیا۔ ڈاکٹر شکیب ان ماہرین آثار قدیمه میں سے ہیں جو دوسروں کو آثار قدیمه میں تبدیل ہوتے دیکھ کر تو بہت خوش ہوتے ہیں لیکن خود کو ہمیشہ جوان رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے بالوں میں پھیلتی سفیدی کو دیکھ کر بہت خوش ہونے اور بولے ”اب تمہاری شخصیت معتبر ہوتی جاری ہے۔“ ہم نے کہا ”زندگی کی آخری گھزوں میں آدمی میں اتنی معتبری تو آ جاتی ہے۔“ نقی اور شکیب دونوں کو یہ فکر تھی کہ ہم ائیر پورٹ سے باہر نکل آئیں تو ہم لندن کی سردی کو کس طرح قبول کریں گے۔ ہم نے کہا ”آپ حضرات ہماری فکر نہ کریں۔ دوستوں کی سرد مہری اور دلی کی سردی سے ہماری پرانی شناسائی ہے۔ ہم دانتوں کو بجاتے ہوئے نقی کی کار میں بیٹھ گئے تو نقی نے اچانک ہمارے اطراف ایک بیلٹ کو باندھنا شروع کر دیا۔ جب ہم سیٹ سے اچھی طرح جکڑ دینے گئے تو ہمیں اچانک خیال آیا کہ یہ بہمیں بلاک کرنے اور بعد میں دن کرنے کی تیاریاں ہیں ورنہ کون اپنے جگری دوست کو اس طرح باندھتا ہے۔ ہم سے رہانہ گیا۔ بولے ”یا نقی! تم ہمارے دوست ہو۔ تمہارے لئے جان حاضر ہے۔ ہم بیلٹ میں جکڑے بغیر عی جان دے سکتے ہیں بلکہ اپنی جان پتھلی پر رکھ کر تمہیں پیش کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم ہمیں لندن میں دن کرنے کا خطرناک ارادہ رکھتے ہو۔ مگر جان من پہلے لندن کو دیکھ لینے تو وہ۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ نقی نے زور دار قہقہہ لگا کر کہا ”اب سمجھ میں آیا کہ تم میرے طف نامے سے خوفزدہ ہو۔ یار میں نے تمہیں دن کرنے کی بات صرف ایگریشن والوں کو مضمون کرنے کیلئے لکھی تھی۔ بچپن کے دوست ہو۔ میری قسم پر بھروسہ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ساری زندگی جھوٹی قسمیں کھاتے گذری۔ رعنی کار میں تمہیں بیلٹ سے باندھنے کی بات تو بھیا یہ بھاں کا دستور ہے۔ بیلٹ نہ باندھنے والے ہی سے وصول کیا جاتا ہے۔ تم ابھی ابھی لندن آئے ہو۔ تمہارے پاس جنمانہ ادا کرنے کے لئے پچاس پونڈ جنمانہ ہو جاتا ہے اور للاف کی بات یہ کہ جنمانہ بیلٹ نہ باندھنے والے ہی سے وصول کیا جاتا ہے۔ تم ابھی ابھی لندن آئے ہو۔ تمہارے پاس جنمانہ ادا کرنے کے لئے پچاس پونڈ کہاں سے آئیں گے۔“

نقی کی بات کوں کر دل کو پکھا اطمینان آیا۔ تا ہم حفظ ما تقدم کے طور پر ہم نے ڈاکٹر شکیب کو کواہ بنایا کہ خدا خواستہ اگر ہمیں کچھ ہو گیا تو وہ ہمیں لندن میں فتن نہیں کریں گے بلکہ ہماری فعش کو دلن عزیز کو روانہ کر دیں گے تا کہ دلن والے ہمارا ایک اچھا اور واحد سامقبرہ بنائیں۔ سال کے سال دھوم دھام سے ہمارا عرس وغیرہ منائیں۔ اس وعدہ کے بعد نقی کی کار لندن کی ہڑکوں پر دوڑنے لگی۔



قیام الدین کے گھر ہمارا قیام

صاحبہا وطن عزیز میں آج تک ہمیں کوئی اچھا پڑوی نہیں کیا۔ اسی لئے جب بھی ملک سے باہر جاتے ہیں تو ایک اچھے پڑوی کی تاش میں رہتے ہیں۔ تو کیوں ہمیں شہنشاہ جاپان کا پڑوی بخشنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ ماشاء اللہ بہت اچھے پڑوی ثابت ہوئے۔ کبھی ہماری خیریت نہیں پوچھی اور نہ ہی کبھی شکر یا چائے کی پتی وغیرہ ہم سے منکروائی۔ لندن پہنچتے ہی ہمارے دوست نبی شعیر نے ہمیں بتایا کہ تم گھروں کے دروازے لندن میں ہمارے لئے کھلے ہیں۔ جہاں مناسب سمجھو دہاں قیام کرنا۔ ہم نے کہا ”پہلے تو یہ بتا دو کہ ہمارے تعلق سے تمہارے اپنے گھر کے دروازوں کا کیا رویہ ہے؟“

بولے ”تمہارے لئے تو میرے گھر کے دروازے اگر بند بھی ہوں تو توڑے جاسکتے ہیں۔ مگر میں خود بوجوہ ان دونوں اپنے ایک حیدر آبادی دوست قیام الدین کے ہاں متین ہوں۔ چاہو تو تم بھی وہیں قیام کر لیا۔“

ہم نے کہا ”یار نبی تم قیام الدین کے ہاں قیام کرو یا طعام الدین کے ہاں۔ آج کی رات تو ہمارا قیام و طعام وہیں رہے گا جہاں تم قیام کر رہے ہو۔ چاہے یہ گھر قیام الدین کا ہی کیوں نہ ہو۔ بہ شرط یہ ہے کہ اڑوں پڑوں اچھا ہوا چاہیے۔“

بولے ”قیام الدین ہم پسندید میں رہتے ہیں اور تمہارے ہے ہیں۔ ہم پسندید لندن کا شہر علاقہ ہے۔ ویسے تو لندن (۲۷) مریع میل پر پھیلا ہوا ہے لیکن سیاحوں کا لندن یعنی اصل ٹارنیجی لندن جنوب میں جیلیسی سے ہم پسندید تک پائچ میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ہم پسندید لندن کا ایک قدیم اور تاریخی علاقہ ہے۔ اس کے چھپ چھپ پر بہ طائفی کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ یہاں شرفا اور

مہذب لوگ رہتے ہیں۔ انگریزی کے مشہور شاعر کیلش بھیں رہتا تھا۔ بر طالوں کی منگر ہیر الداکی بھی بھیں رہتے تھے۔ رابندا تھیں گورنمنٹ آئے تھے تو اسی علاقے میں فروش ہوئے تھے۔“

ہم نے کہا ”یہ تو تم ماضی کے پڑوسیوں کا ذکر کر رہے ہو۔ حالیہ پڑوسیوں کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔“ بولے ”مشہور لیبرلیڈر مائیکل فٹ ہماری محلی کے گھر پر رہتے ہیں روز صحیح کو بھیں دوڑ لگاتے ہیں۔ چاہو تو تم بھی ان کے ساتھ دوڑ لگانا اور ہاں ایک بات اور بتانا چلوں کہ تم پسندید میں جس قسم کا حسن دکھائی دیتا ہے وہ لندن کے کسی علاقے میں دکھائی نہیں دیتا۔“

ہم نے کہا ”حسن کا ہمارے سامنے ذکر نہ کرو دیسی حسن نے دل پر جو گھاڑ لگائے ہیں وہی کیا کم ہیں کہ اب ہم بدیسی گھاؤ سے اپنا سینہ چھلنی کرتے پھریں۔“ سو ہم اچھے اور حسین پڑوسیوں کے ساتھ ہم پسندید میں اپنے حیدر آبادی دوست قیام الدین کے گھر مقیم ہو گئے۔ قیام الدین سے اگر چہ ہماری ملاقات لندن میں ہوئی لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ ہمیں اور ہم انہیں جنم جنم سے جانتے ہوں۔ وجہ اس کی غالباً یہ تھی کہ انہوں نے اپنی جوانی جن گلیوں میں کھوئی ہے وہیں کہیں ہم نے بھی اپنی جوانی کسی قدر رضاخیر سے کھوئی ہے بلکہ اب بھی موقع ملتا ہے تو اپنی پنجی کھی جوانی کہونے جاتے ہیں۔ قیام الدین پچھلے بائیس ہرسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ لندن کے کسی سرکاری ففتر میں کام کرتے ہیں۔ ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں بلکہ ترقی تنویر کا بیان ہے کہ ہماری آمد کے پیش نظر ہی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی لندن میں ایک اپسے ریٹائر ڈاؤن کی ضرورت تھی جس کی معیت میں ہم لندن کی گلیوں کی خاک وغیرہ چھان سکیں۔ تیری منزل پر ان کا پہنچنے سے خوبصورت فلیٹ ہے جس میں ہم مقیم ہیں۔ ایک عی طرز پر بننے ہوئے تین منزلہ فلیٹ بہت خوبصورت لگتے ہیں۔

ہم نے قیام الدین سے کہا ”آپ کو لندن کی تاریخ سے خاصی پچیسی معلوم ہوتی ہے۔ تبھی تو آپ نے ایک تاریخی محلہ میں مکان لے رکھا ہے۔“

ہمارے اس سوال کے جواب میں قیام الدین نے اپنے ڈرائیگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا

اور پوچھا ”اس منظر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

ہم نے دیکھا دور تک چھوٹی چھوٹی پیاریاں پھیلی ہوئی ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکان بننے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ انواع و اقسام کے درختوں کے جھنڈناظر آرہے ہیں۔ ہم اس منظر کی لفڑی میں کھونے والے ہی تھے کہ قیام الدین نے پھر پوچھا ”آپ نے بتایا نہیں کہ اس منظر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

ہم نے منظر میں مزید ڈوبتے ہوئے کہا ”بہت اچھی رائے ہے۔“

بولے ”میں آپ کی اچھی یا بدی رائے جانانا نہیں چاہتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا منظر آپ نے اس سے پہلے کہیں دیکھا ہے؟“

ہم نے بے خیالی میں کہہ دیا ”جاپان میں دیکھا ہے۔“

بولے ”جاپان کو ماریئے کوئی۔ کیا آپ کو یہ منظر ہمارے بخارہ ہلز کی طرح دکھائی نہیں دیتا؟“ ہم نے ان کا دل رکھنے کے لئے ہاں میں ہاں ملائی تو بہت خوش ہوئے۔ پھر ہمیں اپنے باور پچی خانہ میں لے گئے۔ باور پچی خانہ کی کھڑکی کھوئی تو ہمیں سامنے ہی ایک بڑا سا درخت نظر آیا۔ درخت کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولے ”تائیئے یہ کہنا درخت ہے؟“

ہم کوئی ماہر باتیات تو ہیں نہیں بلکہ ہمیں تو آم کے پیڑی اور امرود کے پیڑی میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کسی پیڑی کو اس وقت تک پہچان نہیں سکتے جب تک کہ اس پر چل نہ لگ جائے۔ ہم نے سوچنے کی اوکاری کرتے ہوئے کہا ”خمر و رکوئی حیدر آبادی درخت لگتا ہے، غالباً اٹلی کا درخت معلوم ہوتا ہے۔“

بولے ”بالکل تھیک کہا آپ نے۔ اگر چہ یہ اٹلی کا درخت نہیں ہے لیکن ہو بہو اٹلی کے درخت کا سالگتر ہے۔ اٹلی میں اتوار کے اتوار سا و تھال سے لاتا ہوں۔ اس درخت کو دیکھ کر سالن میں الی ڈالتا ہوں تو اٹلی کی کھٹاس میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور حیدر آباد کی یاددازہ ہو جاتی ہے۔“

اٹلی، اٹلی کے پیڑی اور اٹلی کی کھٹائی کی معرفت حیدر آباد سے قیام الدین کی جذباتی واہشگی کا

اندازہ لگانے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم لندن آنے کے باوجود حیدر آبادی میں مقیم ہیں۔ اگرچہ ہم نے لندن کی گلی گلی کی خان چھانی ہے لیکن اس کے باوجود اگر آپ کو یہ محسوس ہو کہ ہم نے لندن کو اس طرح نہیں دیکھا جس طرح کہ ہمیں دیکھنا چاہئے تھا تو اس میں قصور ہمارا نہیں قیام الدین کا ہے۔ ہم دن میں زیادہ تر ان ہی کے ساتھ لندن کی سیر کو نکلتے ہیں۔ رات کی سیر میں البتہ انہیں ساتھ نہیں رکھتے کیونکہ اس میں ان کی بھلاقی کے علاوہ ہماری اپنی ہربادی بھی مقصود ہے۔ وہ ہر لمحہ حیدر آباد کو نہ صرف یاد کرتے ہیں بلکہ ہم پر مثالوں کے ذریعہ یہ واضح کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ حیدر آباد، لندن سے زیادہ خوبصورت شہر ہے۔ ہم چونکہ ان کے مہمان ہیں اسی لئے ان کی بات مان لیتے ہیں۔

ہم نے لندن کا پہلا دن انہی کے ساتھ گزارا۔ ہمیں لندن کی سردوی سے بچنے کے لئے فوراً ایک اوورکوت خریدا تھا۔ قیام الدین نے کہا ”آسفورڈ اسٹریٹ پر مارک اینڈ اپنسر کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے خرید لیتے ہیں، اچھا اور ستالے گا۔“

نقی نے بات کو کاشتہ ہوئے کہا ”وہ یہودیوں کا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے، وہاں سے ہر گز نہ خریدو۔ تمہارے اوورکوت خرید نے سے کہیں وہ اور بھی مالدار نہ ہو جائیں۔“

قیام الدین نے کہا ”یہودیوں کا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے تو کیا ہوا۔ یہ ایک الی سرڑک پر واقع ہے جسے دیکھ کر حیدر آباد کی ایک سرڑک سیاہ آ جاتی ہے۔“

ہم انہیں کے ساتھ پہلے پہلی لندن کی زیر زمین ٹرین ”ٹیوب“ میں بیٹھنے۔ ہمیشہ ڈے سے پہلی سرکس کا فاصلہ بمشکل میں منت میں طینے ہوتا ہے۔ البتہ بوشن کے اٹیشن پر ہمیں پہلی جانے کے لئے سدرن لائن کو چھوڑ کر پہلی لائن کی گاڑی پکڑنی پڑتی تھی۔ قیام الدین نے ہمیں بتایا کہ ہم ہمیشہ بوشن پر گاڑی بدل کر پہلی لائن لیا کریں۔ یہ ہمارا پہلا دن تھا۔ لہذا ہم نے کہا ”آج تو ہم آپ کے ساتھ ہیں جب اکیلے لندن کی سیر کو نکلیں گے تو بوشن کا خیال رکھیں گے۔ ہم نے تباہ تک بر طائفیہ کے راجح وقت سکوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ لہذا قیام الدین نے ہی

ہمارا نکٹ خریدا۔ ہم بوسٹن کے ائیش پر پکاؤلی کا نکٹ لینے کے لئے قیام الدین کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے کہ ایک منزل پر قیام الدین نے تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم بھی ان کے تعاقب میں بھاگنے لگے۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے بڑی عجلت کے ساتھ ایک کاؤنٹر سے لگتے خرید اور نکٹ چیکر کو دکھا کر پھرتی سے دوڑی طرف کوٹکل گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے جانے لگتے تو نکٹ چیکر نے ہمیں روک لیا اور ہم سے نکٹ دکھانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ ہم نے کہا بھی جو صاحب تیزی سے ادھر گئے ہیں انہوں نے ہمارا نکٹ آپ کو دیا ہوگا کیونکہ ہم تو انہی کے ساتھ ہیں۔“

نکٹ چیکر نے ہم سے کہا ”معاف کیجئے! جو صاحب بھی گئے ہیں انہوں نے آپ کا کوئی نکٹ نہیں دیا۔ میں مجبور ہوں۔ آپ کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

یہ سن کر ہمارے پیروں تسلی سے بوسٹن کی زمین نکل گئی۔ ہماری جیب میں ایک نہیں بھی۔ سو چاہب نہیں رک کر رہنے میں عافیت ہے کیونکہ ما رک اینڈ اپنسر کے ڈپارٹمنٹ میں اسٹور پر پہنچنے کے بعد قیام الدین ہمیں اپنے پیچھے نہیں پائیں گے تو وہ ضرور ہماری ٹاٹش میں پھر بوسٹن ائیش پر آئیں گے اور ہم انہیں کھڑے ہوئے مل جائیں گے۔ ہم نے نہی کا نون نمبر بھی اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا کہ اسے فون پر اپنی پٹا ناتے۔ مگر فون کرنے کے لئے بھی تو دس پیس کی ضرورت تھی۔ چار دن چار ایک کونے میں کھڑے سوچتے رہے کہ قیام الدین پکاؤلی کی گاڑی میں بیٹھے جا رہے ہوں گے۔ اور اب انہیں پتہ چلا ہوگا کہ ہم ان سے پچھڑ گئے ہیں۔ لیکن ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گذرے تھے کہ قیام الدین اپنی چیلوں کو ٹھیک کرتے ہوئے ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ نکٹ چیکر کو پار کر کے ہماری طرف آئے تو ہم نے کہا ”آپ غالباً عجلت میں ہمارا نکٹ لیما بھول گئے تھے۔ نکٹ چیکر نے ہمیں اندر آنے نہیں دیا۔“

قیام الدین نے بڑی سمجھیگی سے پوچھا ”کیا آپ کو بھی آرہا ہے؟“

ہم نے کہا ”آپ کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمیں کیا آرہا ہے؟“

بولے ”بھائی! کیا آپ کو بھی پیش اب آرہا ہے؟“
ہم نے نفی میں جواب دیا تو بولے ”میں تو پیش اب کرنے گیا تھا۔ جو نکٹ خرید اتحاد پیش اب کرنے کا تھا۔ آپ نے بتایا نہیں ورنہ میں آپ کا نکٹ بھی لے لیتا۔“

ہم نے پوچھا ”کتنے کا نکٹ ہے؟“

بولے ”میں سیس کا۔“

ہم نے میں پس کو ہندوستانی سکھ میں تبدیل کیا تو جواب آیا تین روپے۔ (پندرہ روپے کا ایک پورڈ ہوتا ہے اور ایک پورڈ میں سو سیس ہوتے ہیں۔)

ہم نے کہا ”قیام الدین صاحب ہمارا پیش اتنا قیمتی نہیں ہے بلکہ ہمارا تو کجا بھائی مرارجی دیباتی کا پیش اب بھی اتنا قیمتی نہیں ہو گا کہ ایک پیش اب پر تین روپے خرچ کریں۔ ہمارے ہاں تو اتنے روپیوں میں اتنی ہی مقدار کا کوئی اچھا سا شروع مل جاتا ہے۔“

پس کر بولے ”اصل میں گھر سے نکلتے وقت میں پیش اب کرنا بھول گیا تھا اسی لئے عجلت میں جانا پڑا اور نہ میں ایسی فضول خرچی نہیں کرنا۔“

ہم نے کہا ”یہ اچھا ہوا۔ اگر آپ نہ بھولتے تو ہمیں یہاں کے آٹے دال کا بھاؤ کیوں نہ معلوم ہوتا۔“

بولے ”آپ بھی دلچسپ آدمی ہیں۔ اس میں آٹا کپاں ہے اور دل کپاں ہے۔ لندن میں ہمیں پیش اب کرنے کے معاملے میں وہ سہولت حاصل نہیں ہے جو اپنے حیدر آباد میں حاصل ہے، جب ذرا گردن جھکاتی کر دیا۔“

وہیات کے موضوع کو پھر حیدر آباد کی طرف لے جانے لگے تو ہم انہیں پکڑ کر پکاؤ لائیں کی طرف لے گئے۔ پکاؤ لی سرکس کی پہلی سیر ہم نے قیام الدین کے ساتھی کی۔ قیام الدین بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ صبح کو لمبی ووزنگا کرتے ہیں۔ دوپہر میں پیرا کی کرنے جاتے ہیں۔ شام کو نینس کھیلنے جاتے ہیں۔ اتنی ساری جسمانی ورزش کے بعد اتنا تھک جاتے ہیں کہ شام ہوتے ہی سو

جاتے ہیں۔ ہمارے لندن چینچنے کے بعد انہوں نے سخت جسمانی ورزش کم کر دی تھی۔ اس کی وجہ تھی کہ وہ تیری منزل کے فلیٹ میں رہتے ہیں اور ان لیٹیوں کا صدر دروازہ کسی کے اندر آتے ہی خود بخوبی بند ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تیری منزل پر رہنے والے سے ملنے آئے تو اس شخص کے لئے دروازہ کھولنے کی خاطر کئی سیر ہیاں اتر کر چیخ جانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ پھر یہ اوپر بھی آتا ہو گا۔ ہم سے ملنے کے لئے اتنے لوگ آتے تھے کہ ہر شخص کی آواز پر قیام الدین کو دروازہ کھولنے کے لئے کئی سیر ہیاں نیچے اتر کر جانا اور پھر اوپر آنا پڑتا تھا۔ دو چار دنوں تک تو ان کی دوڑ، پیرا کی، ٹینس اور سیر ہمی چڑھائی ساتھ ساتھ جاری رہی۔ بعد میں ماشاء اللہ اتنی سیر ہیاں اترنے اور چڑھنے لگے کہ پہلے صبح کی دوڑ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بعد میں ٹینس کو خیر باد کہا اور پھر پیرا کی کوئی تہہ کر کے رکھ دیا۔

ان کا ایک اور محبوب مشغله دوستوں کی دعویٰ میں کہا اور حیدر آبادی کھانا پکانا ہے۔ جتنے اچھے اور لذیذ حیدر آبادی کھانے ہم نے قیام الدین کے ہاں کھائے کبھی خود حیدر آباد میں نہیں کھا سکے۔ حیدر آبادی بریانی، بگھارے بیگن، دہی کی چینی، کچوری، نہاری اور ٹماڑ کا کٹ وغیرہ تو بناتے ہی تھے مگر بعض اوقات بڑے ولچپ کھانے بھی بنادیتے تھے۔ ایک دن قطب شاہی قورمہ بنیا۔ بہت پسند آیا۔ ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر پوچھا یہ قورمہ محمد قلی قطب شاہ کے دور کی پیداوار ہے یا عبد اللہ قطب شاہ کے دور کی دین ہے۔ بولے ”قطب شاہیوں کو لندن آئی کب نصیب ہوا تھا کہ وہ قورمہ کھاتے یا ایجاد کرتے۔ یہ قورمہ تو ایجاد بندہ ہے۔“ ڈمن سے محبت کی خاطر اس قورمہ سے قطب شاہیوں کی نسبت جوڑ دی۔ ”ایک دن ”اصحیاعی کوئتے“ بھی بنائے تھے۔ بہت لذیذ تھے۔ ایک بار ہم محبت میں کہیں جا رہے تھے۔ قیام الدین نے پوچھا ”آج رات کیا کھانا چلے گا؟“ ہم نے انہیں ہالنے کے لئے کہا ”امباڑے کی بھاجی کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔“

ہم نے سوچا تھا کہ امباڑے کی بھاجی کی فرمائش کے بعد قیام الدین کے دانت کھٹے ہو جائیں

گے۔ رات والپس ہوئے تو جج امباڑے کی بھاجی تیار تھی۔ ہم نے پوچھا ”ہمیں دلی میں امباڑے کی بھاجی نہیں ملتی۔ آپ کو یہ جلس گر اس ما یہ لندن میں کہاں سے مل گئی؟“ نظریں پنجی کر کے بولے ”پنے دلی سے محبت ہو تو پر دلی میں بھجی دلی کے مل جاتی ہے۔“ ہم نے ان سے مزید نہیں پوچھا کہ انہیں امباڑے کی بھاجی کہاں سے مل گئی چونکہ جو شخص دیا رغیر میں رہ کر بھجی دلکن میں رہتا ہواں سے ایسا بے تکا سوال پوچھنا بیکار تھا۔ قیام الدین و مستوں کے رسایاں۔ لندن میں باکیس بریں تک رہنے کے باوجود انہوں نے حیدر آبادی خلوص و محبت کو جس جتن سے محفوظ رکھا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس قدر ثوث کر چاہنے والے ہم نے بہت کم دیکھے ہیں۔ ہمارے و مست خیاء الدین شکیب نے قیام الدین کے بارے میں ایک شعر بھی کہا ہے۔

آپ بھی من لیجئے۔

شکیب اپنی طبیعت جب بھی گھبراتی ہے لندن میں
تو ول کھتا ہے چل اے جاں قیام الدین کے گھر چل



بر طانیہ میں دھوم ہماری

زبان کی ہے

چھپھلے چار پانچ برسوں میں یہ جو ہم نے ملکوں ملکوں کی خاک چھانی ہے اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ان ملکوں کی سیر و سیاحت مقصود تھی۔ سختاً ہم تو ان ملکوں میں اردو کو تلاش کرنے گئے تھے۔ خدا کے فضل سے جاپان جیسے کاروباری ملک میں، جہاں اردو تو اردو انگریزی تک کوکوئی نہیں پوچھتا، وہاں بھی ہم نے اردو کو ڈھونڈ کر لاتھا اور اہل وطن کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ جاپان میں اردو خیریت سے ہے اور اسے آپ کی نیک خیریت مطلوب ہے۔ جہاں تک بر طانیہ کا معاملہ ہے وہاں ہم گئے ہی اردو کے چکر میں تھے۔ اردو مجلس (بر طانیہ) کے مہمان تھے۔ آنے جانے کا کرایہ، کھانے، کپڑے اور پان بیڑی کے خرچ پران سے ہمارے دورہ بر طانیہ کا مقابلہ دٹھنے ہوا تھا اندر وون ملک بھی ہم کم ویش انہی شرکانظ پر اردو تنظیموں کے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ البتہ کپڑا دینے کی شرط نہیں لگاتے۔ بر طانیہ میں اس لئے رکائی پڑی کہ ہمارے ہاں ایسے کپڑے نہیں تھے جو وہاں کی سرداری اور وہاں کی اردو کو موافق آسکیں۔

اردو مجلس، بر طانیہ کی اہم اردو تنظیموں میں سے ایک ہے۔ اسی انجمن نے ۱۹۸۰ء میں ایک یادگار اور تاریخی آل انگلینڈ اردو کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس انجمن کے معتمد ہمارے دوست عباس زہدی ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ہمارے ہم عصر رہ چکے ہیں۔ چونکہ بے حد چذبائی آدمی ہیں اسی لئے اردو کی خدمت کے لئے نہایت موزوں شخصیت ہیں۔ اردو کے لئے ہمیشہ سر سے کفن باندھ رہتے ہیں اور اسی لئے یا تو یہ دوستوں سے مارش رہتے ہیں یا دوست ان سے مارش

رہتے ہیں۔ ہم سے اپنی شدید محبت کے باعث لندن یونیورسٹی کے ہمارے پہلے جلسے میں اتنے جذباتی ہو گئے اور ہمارے تعارف میں کچھ اتنا غلوکر گئے کہ ہمیں ان کے تعارف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بہت زور لگانا پڑا۔ مگر شکر خدا کا کہ لندن والے بھی عباس زیدی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسی لئے ہماری جان فتح گئی اور انہوں نے ہم سے اتنی ہی توقع رکھی جس کے ہم اہل تھے۔ پیر ستر غلام یزدی اردو مجلس کے صدر ہیں۔ یہ بھی یونیورسٹی میں ہمارے ہم عصر رہ چکے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کی شہرت کھلاڑی کی حیثیت سے تھی۔ ہمیشہ کسی نہ کسی درون خانہ یا پیروں خانہ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔ اب لندن میں پیر ستری کرتے ہیں اور لوگوں کی زندگیوں سے سمجھتے ہیں۔ کسی کھیل بھجوانا یا کسی کو پھانسی کے تجھے سے واپس بلوانا ان کے باعث میں ہاتھ کا کھیل بھی ہے بلکہ اب تو یہ کھیل ان کا پیشہ بن گیا ہے۔ لندن میں کروڑ چیزوں کے محلے سے ترب رہتے ہیں۔ لکھ چیزوں کی زندگی گزارتے ہیں۔ اردو مجلس تو خیر ہماری ہیز بان تھی ہی لیکن اس کے علاوہ ہمیں لندن میں کئی اردو تقاریب میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ ہمارے زیادہ تر جلسے لندن یونیورسٹی میں ہی ہوئے جس میں شرکت کے لئے لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے آتے تھے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر یوسف علی خاں تو تمدن سو سیل کی مسافت طئے کر کے کوچسر سے آتے تھے۔ جس کسی سے پوچھنے معلوم ہوتا کہ کم از کم پچاس سیل کی مسافت طئے کر کے آیا ہے۔

اردو کے لئے ذوق و شوق صرف لندن ہی میں دیکھا۔ یہاں کی طرح نہیں کہ اردو کی کوئی محفل ہمارے گھر سے چار کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر منعقد ہوتا ہم اس میں شرکت کرنے کو ایک غیر شرعی حرکت سمجھتے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ بر طائیہ میں ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ اردو بولنے والے موجود ہیں اور کم از کم پانچ سو اردو تنظیمیں ہیں۔

ہم نے کہا ”دس لاکھ اردو بولنے والوں کے لئے صرف پانچ سو تنظیمیں نہایت ناکافی ہیں۔“ ہمارے حساب سے دس لاکھ اردو بولنے والوں کی کم از کم بیس لاکھ اردو تنظیمیں تو ہوئی چاہیں۔

ہماری عی مثال بیجئے کہ اول تو ہم خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ اس کے علاوہ ایک انجمن کے حزل سکریٹری ہیں، وہری انجمن میں نائب صدر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ تیسری انجمن میں ہم صدر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں، پانچویں انجمن کے ہم مشیر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی انجمنیں ہیں جو ہم سے رہنمائی ہر پرستی اور روشنی وغیرہ حاصل کرتی رہتی ہیں۔ غرض انجمن سازی اور خانہ بر بادی اردو کلچر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

بر طانیہ اور ہندوستان کے اردو شاعروں اور ادیبوں میں کئی ممالتوں کے باوجود ایک واضح فرق ہے میں یہ نظر آیا کہ بر طانیہ کے اردو شاعر ہمارے شاعروں کی طرح ”ہمہ وقتی شاعر“ نہیں ہیں بلکہ ہفتہ کے پانچ دن بھی کام بھی کرتے ہیں۔ البتہ جمعہ کو شام سے اتوار کی رات تک ”عرض کیا ہے“، اور ”ڈڑہ نوازی کا شکریہ“ وغیرہ میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں خدا نخواستہ کسی شاعر کا کلام اچھا ہوتا وہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے رکشا کا کرایہ بھی مانگ لیتا ہے۔ بر طانیہ کا اردو شاعر رکشا کا کرایہ نہیں مانگتا بلکہ اپنی موڑ میں جاتا ہے (چاہے اس کا کلام اچھا ہی کیوں نہ ہو)۔ بر طانیہ کے مختلف شہروں میں آئے دن آل انگلینڈ مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ بر طانیہ کے اردو شاعروں اور ادیبوں کو دیکھ کر ہمیں یہ خوشی ہوئی کہ بر طانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے اندر، حسد، رتابت، غبیت اور معاصرانہ چشمک جیسے ضروری جذبوں کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا ہے۔ یوں بھی ان ضروری جذبوں کے بغیر اردو تہذیب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ لندن کی کسی اردو محفل سے ہم جلدی اٹھنا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ہمارے جاتے عی لوگ کہیں ہماری غبیت نہ شروع کر دیں۔

بر طانیہ میں یہ جوار و کاما حول ہے میں میسر آیا تو جی خوش ہو گیا مگر ہماری یہ خوشی پندرہ دنوں میں کافور ہو گئی۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ اگر لگاتا رہندرہ دنوں تک ہم انگریزی نہ بولیں تو ہماری طبیعت ناساز ہو جاتی ہے۔ زبان پر ورم آ جاتا ہے۔ ماشاء اللہ اپنے دفتر میں ہر روز اتنی انگریزی بول اور لکھ لیتے ہیں کہ انگریز بھی ہمیں دیکھے تو رشک کرنے لگ جائے۔ ہم نے ابتداء میں لندن میں

اپنے احباب سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش بھی کی گئی وہ ہم سے انگریزی میں بات کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ تو انگلستان میں ہی رہتے ہیں۔ اگر ہم سے بھی انگریزی میں بات کرنا پڑے تو ہمیں بر طانیہ بلانے کا کیا فائدہ۔ یہ سرہran کی خود فرضی تھی۔ لہذا پندرہ دنوں بعد ہم مسلسل اردو بولنے کی وجہ سے پریشان سے رہنے لگے۔ ایک دن یہ تمہارے بیچ پر ایک انگریز نے ہم سے سُگریٹ مانگا تو ہم نے سُگریٹ دینے سے پہلے اس سے انگریزی میں اس کی خیریت پوچھنے کے علاوہ یہ بھی پوچھا کہ میاں کیا کرتے ہو، گھر میں بال بچے دغیرہ تو خیریت سے ہیں نا۔ اس نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ صرف سُگریٹ لے کر ”تھینک یو“ کہا اور آگے کو نکل گیا۔ تب ہمیں یقین آیا کہ انگریز کسی تعارف کے بغیر کسی اجنبی سے سُگریٹ توانگ سکتا ہے لیکن اس سے بات نہیں کر سکتا۔ ایک دن آسفوروڈ اسٹریٹ پر ایک بڑھیانے ہم سے ایک پونڈ مانگا۔ ہم نے سوچا کہ ضرورت مندرجہ ہیا ہے۔ اس کی مجبوری سے قائدہ اٹھا کر انگریزی میں بات کرنے کا اور موقع ہے۔ ہم نے پوچھا ”بڑی بی کیا کرتی ہو؟ کہاں رہتی ہو؟“ تمہیں ایک پونڈ کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ اگر ہمیں معلوم ہونا کہ ۷۷۸۲ء میں ہمارے ملک کو آزاد کرنے کے بعد تمہاری یہ حالت ہو جائے گی تو بخدا جدوجہد آزادی کی مخالفت کرتے۔ ”مگر بڑھیانے ہمارے احتی سارے سوالوں کے جواب میں صرف اتنا بتایا کہ وہ فرانسیسی ہے اور انگریزی نہیں جانتی۔ خیر بند فرانس دوستی کے نام پر اسے ایک پونڈ دیا اور آگے کو نکل گئے۔

غرض انگریزی کی شدید ترقیت اور سرہran کے پس منظر میں ایک دن ہم بی بی سی میں اپنا اشتو یو روکارڈ کرنے گئے تو ہمارے دوست اور بی بی سی کے پروڈیوسر مجیب صدیقی نے ہمارا تعارف بی بی سی کے ایک انگریز عہدیدار سے کرایا۔ ہم نے سوچا یہ انگریزی بولنے کا بہترین موقع ہے۔ لہذا ہم نے آؤ ویکھانہ تاؤ ان پر اپنی انگریزی سے حملہ کر دیا اور لگئے طرح طرح کے سوالات پوچھنے۔ ”یہ بش ہاؤس، جس میں بی بی سی کا دفتر ہے اتنا معمولی اور سیدھا سادا سا کیوں ہے؟ اگرچہ آپ کی ملکہ بھی ایک سیدھے سادے محل میں رہتی ہیں اور بر طانیہ کے وزیر اعظم کا گھر بھی یونہی سا ہے لیکن بی بی سی جس کی خبریں سنے بغیر نہ تو ہمارا کھانا ہضم ہونا ہے اور نہ یہ آپ کو کھانا ملتا

ہے، اس کا دفتر تو کم از کم کسی عالیشان عمارت میں ہونا چاہیے تھا۔ اور ہاں ایسا اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔ ہم تو آپ کے ملک میں انگریزی بولنے کے لئے تھے۔ سمندر سے لمبے پیاسے کو شہنم۔ بخلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے، اور سنائیں کیا حال ہے آپ کا؟“

ہم نے سوچا تھا کہ ہماری انگریزی کے جواب میں بی بی سی کے انگریز عہدیدار موصوف ضرور اپنے مخصوص لہجے میں انگریزی بولیں گے اور اس کے جواب میں ہم پھر انگریزی بولیں گے اور یوں ہمارا کچھ بھٹکنا ہو جائے گا۔ لیکن ان انگریز عہدیدار نے اچانک نہایت فصیح اردو میں ہم سے کہا ”حضور والا! آپ کھڑے کیوں ہیں، تشریف رکھئے۔ یہ باتیں تو بیٹھ کر بھی کی جاسکتی ہیں۔“ یہ انگریز عہدیدار تھے مسٹر ڈیوڈ تھج جو بی بی سی کے اردو شعبہ کے انچارج ہیں۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ ہم دہلی سے لندن آئے ہیں لیکن وہ ہم سے حیدر آباد کا حال پوچھتے رہے۔ (اس وقت یقین آیا کہ بی بی سی کی عام معلومات کتنی اچھی ہیں) بعض حیدر آباد یوں کے بارے میں پوچھا، جناب عبدالغیث خان ایڈیٹر ”سیاست“ کی خبریت پوچھی، ہم سے روزنامہ ”سیاست“ کی تعداد اشاعت کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے اپنے قیاس کے مطابق تعداد اشاعت بتائی تو بولے ”جی نہیں! یہ سرکیویشن تو دوسری پہلے کی ہے۔ اب تو اس سرکیویشن میں غالباً مزید چار پانچ ہزار کا اضافہ ہو گیا ہے۔“

ہم نے ہار مانتے ہوئے کہا ”بہت دنوں سے بی بی سی کو سننے کا موقع نہیں ملا۔ اسی لئے ”سیاست“ کی موجودہ سرکیویشن کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ آپ کی اطلاع یقیناً مصدقہ ہوگی۔“ صاحبو! اس سانحہ کے بعد ہم نے پھر کبھی انگلستان میں انگریزی میں بات کرنے کی حرمت نہیں کی۔ سارا دن اردو شاعروں اور ادیبوں کی صحبت میں ہیت جاتا تھا۔ اردو مرکز اور اس کے سکریٹری افتخار عارف کا ذکر پھر کبھی تفصیل سے کریں گے۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری نہیں ہیں کہ پکا ڈلی سرکس جب بھی جاتے تھے تو اردو مرکز میں ٹھیکی ضروریت پیتے تھے کیونکہ یہاں احمد فراز، شہرت بخاری، فارغ بخاری اور کئی ادیبوں کے علاوہ اردو کے کئی رسالوں اور

اخبارات سے ملاتات ہو جاتی تھی۔ ان کے علاوہ لندن میں جن اولیٰ شخصیتوں سے ملاتا تھا ہوئیں ان میں پروفیسر ڈیوڈ میٹھیوز، سحاب تزلباش، اکبر حیدر آبادی، یا ورعیاس، رضا خلی عابدی، وقار لطیف، جن عسکری، جبیب حیدر آبادی، صدیقہ شہنم، عاصم موسوی، دھرم پال جی، سوہن رہی، راجنیجیتی، عدیل صدیقی، ایوب اولیا، باقر نقوی، معین الدین شاہ، چاند کرن صاحب، شمس الدین آغا، فردوس، عزیز الدین احمد، مصطفیٰ علی خاں، مریم کاظمی اور کرشن کوئٹہ تاہل ذکر ہیں۔

ان احباب کی عنایتوں اور محبوتوں سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم اپنے گھر میں نہیں ہیں۔

اس لئے زیادہ خوش و خرم اور آرام سے ہیں۔

یوں تو انگلستان سے کئی اردو چھتہ وار اور ماہنامے نکلتے ہیں لیکن لندن سے دوار دور روزنامے "جگ" اور "ملن" بھی نکلتے ہیں۔ ہمیں افتخار عارف کے ساتھ روزنامہ "جگ" کے دفتر میں جانے کا موقع ملا۔ "جگ" لندن کے لیٹریٹر اشرف تاضی نہ صرف تپاک سے ملے بلکہ نیوز لیٹریٹر قیصر امام، اشتث ایڈیٹر زیڈ خان اور چیف روپر ٹھپور نیازی سے ہمارا تعارف بھی کر لیا۔ ہم نے ان کا پریس بھی دیکھا۔ ان دونوں حلال کوشت کے منسلے پر بریڈ نورڈ میں خاصے اجتماعی مظاہرے ہو رہے تھے۔ "جگ" میں ان مظاہروں کی خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ "جگ" میں چھپے ہوئے بعض اشتہارات کو دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ اردو کا اخبار چاہے لندن سے نکلے یا مالیگاؤں سے وہ اپنے مزاج اور کردار کو برقرار رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک "ملاپ" بھی لندن سے نکلا تھا مگر اب نہیں نکلا۔ ساؤ تھال میں ہندوستان اور پاکستان کے سارے اولیٰ، ثیم اولیٰ اور غیر اولیٰ رسائل مل جاتے ہیں۔

ہم نے لندن میں ایک بات بطور خاص محسوس کی کہ بنگالی اور یون کا جلسہ ہوتا ہے تو صرف بنگالی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر زبان کے جلسہ میں عموماً اسی زبان کے بولنے والے شریک ہوتے ہیں لیکن جب اردو کا کوئی جلسہ ہوتا ہے تو اس میں نہ صرف بنگالی، بنگالی، سندھی اور دیگر زبانیں بولنے والے شریک ہوتے ہیں بلکہ برصغیر کے تین بڑے ممالک ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے متعلق باشندے بلا خا ظمذہب، زبان و تمدن شرکت کرتے

ہیں۔ اردو زبان کو جو کروار بر صغیر میں او اکرنا چاہئے تھا اسے وہ غیر محسوس طور پر لندن میں او اکر رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو نا رکان وطن اردو کی محبت کے ساتھ انگلستان میں آباد ہو گئے ہیں ان کی نئی نسل اس زبان کو کس حد تک اپنے سینہ سے لگائے رکھتی ہے۔ لندن کے بعض اردو شاعروں اور ادیبوں کی اولاد جو انگلستان میں پیدا ہوئی ہے اسے نہیں معلوم کر، "مکر ارشاد" کس کو کہتے ہیں؟ "عرض کیا ہے" کا حرہ بہ شاعر کب استعمال کرتا ہے؟ اب وقت ہی فصلہ کرے گا کہ انگلستان کے اردو شاعروں اور ادیبوں کی "اولاد حقیقی" نا خلف ہے یا ان کی "اولاد معنوی" نا خلف ہے۔



کچھ ذکر خیر و شر ساقی فاروقی کا

لندن میں ہماری وہ پہلی شام تھی۔ دن بھر پکاؤلی سرکس کی رونق کا حصہ بننے کے بعد، اردو مرکز میں احمد فراز اور افتخار عارف کو اور ڈائلگلر اسکولز میں کبوتروں کو سر آنکھوں پر بٹھانے، برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے کھڑے سر نسلیں جپچل کے مجسمے پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو اڑانے، ویسٹ میڈیا میں کچھ درج جانا نکنے، ہاؤس آف کامنس کے چیچے بیٹھے ہوئے درپائی نئی میز میں جلتے ہوئے سگرینوں کے دلکھرے بھینکنے کے بعد جب ہم گھر پہنچنے تو پتہ چلا کہ کئی دوستوں کے فون آئے تھے۔ تھکن آئی زیادہ تھی کہ کسی کو فون کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں ہم نے ساقی فاروقی کو فون ملا یا۔ ساقی فاروقی اپنی پاٹ دار آواز کے ساتھ فون پر سنائی ویٹے تو ہم نے کہا ”اسلام علیکم۔“ ”وعلیکم السلام یہ کون سلام کر رہا ہے؟“

”ہم نے کہا“ بوجھو تو جانیں۔“

خوارزے سے وقفہ کے بعد فون پر اچانک ایک نا تامل سماحت واشاعت گالی سنائی دی۔ پھر بولے ”ارے بختی! تم بد معاش! اکب آئے، تمہاری تو.... آنے کی صحیح صحیح اطلاع تک نہ دی۔ سالے تم تو.... کہاں تھہرے ہو؟“

”ہم نے کہا“ ڈسپلیڈ میں۔“

بولے ”ارے تم تو میرے گھر سے بالکل قریب ہو۔ مگر تم جیسے لفگے کو ڈسپلیڈ جیسے شریفوں کے محلہ میں کس نے تھہر لیا۔ تم تو.... واقعی.... اور ہاں.... وہ تو....“

ہم نے کہا ”یا ر ساقی! فون انگریز کا ہے۔ اردو کی گالیاں اور وہ بھی تمہارے منہ سے منٹے کا متحمل نہ ہو سکے گا۔“

بولے ”اچھا تو یہ بات ہے۔ نون پر گالیاں سننا نہیں چاہتے۔ میں اور گندی ابھی تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ گالیاں سننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تمہاری تو.....“

پچھلے آٹھ سوں میں ساقی فاروقی جب جب دلی آئے ہیں ان سے ملا تا تھیں ہوتی ہیں دو سال پہلے وہ اپنی جم من بیوی گندی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ (مز ساقی فاروقی کا نام ہی پکھو ایسا ہے کہ ہم ”گندی“ پکارنے جاتے ہیں تو منہ سے ”خندی“ اوہ ہو جاتا ہے۔) بھا بھی مز گندی نہایت خلیق، ملشار اور خوش طبع خاتون ہیں۔ (جم من خواتین بہت کم ایسی ہوتی ہیں۔ یوں بھی ہم دونیں جم من خواتین کو ہی جانتے ہیں۔)

دلی کی ایک ادبی محفل میں ساقی فاروقی کے اردو کلام پر واکا بے پناہ شور بلند ہو رہا تھا تو ایسے میں بھا بھی مز گندی نے بڑی حیرت کے ساتھ ہم سے انگریزی میں کہا تھا ”مچھے معلوم نہیں تھا کہ ساقی اتنے بڑے شاعر ہیں۔“

اور ہم نے کہا تھا ”آپ کے اردو نہ جانئے کا یہی قائد ہو ساقی فاروقی کو پہنچ رہا ہے۔“

ہم ساقی فاروقی کی دوستی اور شاعری دونوں کے قائل ہیں چونکہ ہمارے بڑے بھائی احمد ایتم جلیس مرحوم کے قریبی دوست رہے ہیں۔ اسی لئے ان کی گالیاں بھی مزید ارکٹی ہیں۔ ن.م. راشد کے رفیق خاص رہے ہیں بلکہ ان کی زائی آخری رسومات کے واحد عینی شہید بھی یہی ہیں۔ ساقی کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام بلکہ مجموعہ کلام سننے میں جو لطف آتا ہے اسے بیان کرنے کی مہارت اور طہارت ہم میں کہاں؟ بتول ان کے گھنے میں خطاب لگا کر کلام پڑھتے ہیں۔ جب شعر پڑھتے ہیں تو شعر ان کے روم روم سے اوہ ہونے لگتا ہے۔ ایسے خوش طبع اور شگفتہ مزاج کے جس محفل میں بیشیں لوگوں کو ہنساہنسا کر رہا دیں۔ کھلے دل، کھلے دماغ، کھلے ہاتھ، کھلے گریبان اور کھلے منہ (منہ کچھ زیادہ ہی کھلا ہوا ہے) کے آدمی ہیں۔ ہمارے پسندیدہ شعرا کو وہ سخت پاسند کرتے ہیں۔ ہمارے محبوب انسانہ نگاروں کے ذکر پر ماں بھوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چڑھاتے ہیں بشرطیں کی ہمیں کیے۔ لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ

بھیں بہت اچھے لگتے ہیں۔

ابھی ہم ساقی کی باتیں یاد کر رہے تھے کہ سیاہ پتوں اور سیاہ قیص میں ملبوس، گلے میں سیاہ منکوں کی لمبی مالاڑی ساقی فاروقی، گندی بھا بھی کے ہمراہ ڈرائیک روم میں بھونچال کی طرح داخل ہوئے۔ پہلے ایک عد دگالی دی اور بے ساختہ ہم سے پٹ گئے۔ جب ہم گندی بھا بھی سے ہاتھ ملانے لگے تو بولے ”تم ہمارے خاص دوست ہو۔ تم گندی کو پیار کرو گے ہاتھ نہیں ملاو گے۔“ پھر گندی بھا بھی سے کہا ”مجتبی حسین! ہمارا یار ہے تم اسے کس کرو گی۔“

جب ہم مغربی آداب کے مطابق گندی بھا بھی کو پیار کرنے کے لئے آگے بڑھتے تو گندی بھا بھی کے جس گال پر ہم پیار کرنے والے تھے اس جانب دوز کرتے ہوئے ساقی نے کہا ”ذرائع کھوں تو تم کس طرح گندی کو پیار کرتے ہو۔“ پھر ایک نلک شگاف تپہہ مار کر بولے ”ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ سالا... (ایک مشہور پاکستانی خوا) آیا تھا۔ وہ بھی ہمارا خاص یار ہے۔ ہم نے اس سے گندی کو پیار کرنے کے لئے کہا تو ہمیں یادی نہیں رہا کہ تمنے چار زردوں اور خطرناک بو والے قوام کا پان کھانا ہے۔ پھر اس نے گندی کے گال پر پیار کرنے کے بجائے گندی کے ہونوں پر زردے اور قوام کا لیپ لگا دیا۔ سالے اردو کے شاعر ادیب اور فتاویٰ کو پیار کرنا تو آنے والی نہیں۔ ان کی تو...“ ساقی نے پھر زرد اور تپہہ لگایا۔ پھر بولے ”تم نے مغربی آداب کیا سے سیکھ لئے۔ تمہارے اردو ادیب ہونے میں شبہ ہو رہا ہے۔“

ساقی کی باتوں نے لندن کی ہماری اس پہلی شام کو تھہوں سے اس طرح آراستہ کر دیا تھا کہ رات کے ایک بجھے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ساقی نے ان دنوں کا ذکر چھیرا جب لندن میں امتی پاکستانی اور ہندوستانی آبادی نہیں تھے۔ ان دنوں سا وقہاں بھی ویران تھا۔ کھانے پینے کی ہندوستانی چیزیں بھی نہیں ملتی تھیں۔ مشہور شاعر سحاب تزلیباش کے حوالے سے کہنے لگے ”ایک دن میں سحاب تزلیباش کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ ایک اسٹول پر چڑھی ہوئی ایک اوپنجی میز پر اپنے دونوں ہاتھ آگے اور چیچپے کو بلاری ہیں۔ تربیب جا کر دیکھا تو پتہ پلا کر چھٹائی کے مقصود یوان غالب پر

کوکا کولا کی بوتل کی مدد سے پر اٹھنے بیل رہی ہیں۔ ان پر انہوں کو کھانے بعد ہی غالب کا کلام میری سمجھ میں آسکا۔ لوگ کھانے پکا کر ان کا کئی کئی دن کا اشناک ڈیپ فریز میں محفوظ رکھتے تھے۔ سحاب تزلیاش نے پر اٹھنے بنانے کے بعد ڈیپ فریز کھولا اور مجھ سے پوچھا ”بتاباد کیا کھاؤ گے؟“ اب جو میں نے ڈیپ فریز میں جہان کا تو دیکھا کہ اس میں انواع و اقسام کے کھانے محفوظ ہیں۔ سالمی اور کھانے کی ہر شے کے برتن پر اس کا نام، اس کے پکائے جانے کی تاریخ اور سن اشاعت درج تھا۔ میں کچھ دیر تک تو کھانوں، ان تاریخوں اور منیں کا جائزہ لینا رہا۔ پھر بولا ”میں تو ۱۹۶۰ء کا قیمة کھاؤں گا۔“ اس کے جواب میں سحاب تزلیاش نے کہا ”تم نے دیر کر دی۔ ۱۹۶۰ء کا قیمة کل عی ایک صاحب کھا گئے۔ تم چاہو تو تمہیں ۱۹۵۸ء کے کوئی لٹھا سکتی ہوں۔“

ساقی فاروقی کی صحت ایسی ہی باتوں اور ایسے ہی لطیفوں سے جی سجائی رہتی ہے۔ چونکہ ہمارے ول اور لندن میں ہمارے گھر سے تربیب رہتے تھے اس لئے ان سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی اور تم ان کے لطیفوں کے علاوہ ان کے کلام بلاغت نظام اور بیوفت نظام دونوں سے فیض پاپ ہوتے تھے۔ ساقی جب اردو میں بڑی روانی اور سلاست کے ساتھ گالیاں دینے لگتے تو گندی بھا بھی ہم سے پوچھا کرتی تھیں کہ ساقی اردو میں کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس پر ساقی قہقہہ لگا کر ہم سے کہتے تھے ”مجتبی! اردو کی گالیوں میں اتنی تحریر ہوتی ہے اور ایسی انفرادیت ہوتی ہے کہ تم تو تم اگر مولوی عبدالحق بھی ہوتے تو ان کا انگریزی ترجمہ نہ کر پاتے۔“

ساقی کے ساتھ کئی مختلیں بھیں۔ ایک دن کہنے لگے ”یہ کیا تم لندن کے تاریخی مقامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ تمہیں اوبی لندن وکھاؤ۔ کیس کا گھر تمہارے گھر سے تربیب ہے مگر تم اب تک وہاں نہیں گئے۔ سو ایک دن ہم ساقی فاروقی کے ساتھ اوبی لندن کو دیکھنے دہمڑوں میں نکلے۔ ساقی کی موڑ میں مخفی تعمیم، حمایت اللہ اور ہم تھے۔ دہری موڑ مشہور انسانہ نگار محسن سمشی کی تھی جن کا قہقہہ ان کی موڑ کے ہارن سے زیادہ بلند اور پر شور ہوتا ہے۔ اس میں نقی تنویر سوار ہو گئے۔ ہم بے پہلے کیس کے گھر کی طرف چلے تو ہم پسندید بیٹھے

گزرے۔ ہم پسیڈ کا یہ جنگل اتنا خوبصورت ہے کہ اس کے بعد اس سے گذرتے ہوئے ہم نے بھی اپنے اندر شاعری کو کروٹ لیتے، مخلتے اور مہکتے ہوئے محسوس کیا۔ بھی وہ مقام تھا جہاں پورے پونے دہورہ س پہلے انگریزی کا مشہور شاعر کیش رہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری چار پانچ برس اسی جنگل کے گرد و نواح میں گذارے تھے۔ بچپن میں پڑھی ہوئی کیش کی نظمیں ہم یاد کر رہے تھے کہ ساقی نے ایک جگہ اپنی موڑ کو روکتے ہوئے کہا ”پاکستان کے مشہور اردو محقق کو ہم پسیڈ پڑھ کی سیر کرانے کے لئے میں یہاں لاایا تھا۔ میں نے باتوں با توں میں ان سے کہا“ یہ جو گھنے درخت آپ دیکھ رہے ہیں ان عی میں کسی درخت سے وہ بلبل اڑا ہو گا جسے دیکھ کر کیش نے اپنی مشہور نظم ”Ode to a nightingale“ لکھی تھی۔ جانتے ہو اردو کے محقق نے کیا کہا۔ مجھ سے فوراً پوچھا ” بتاؤ کون سے درخت سے بلبل اڑا تھا۔ کون سے درخت سے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس پر میں نے اسے نہ صرف وہ درخت دکھا دیا تھا بلکہ وہ بلبل بھی دکھا دیا جسے دیکھ کر کیش نے اپنی شہرہ آفاق نظم لکھی تھی۔ سالے اردو کے محقق کیش کے۔ ابھی قہقہوں کا زور نہیں تھا تھا کہ ہم کیش کے گھر پر موجود تھے۔ سید حاساد و منزلہ مکان ہے۔ اسی مکان میں کیش نے اپنی زندگی کی بہترین نظمیں لکھیں۔ اسی گھر سے متصل اسی طرح کا ایک اور گھر بھی ہے جس میں کیش کی محبوبہ نیتی بران رہتی تھی۔ ان کی شادی ہونے والی تھی کہ ۱۸۹۶ء میں کیش کا عین نوجوانی میں انتقال ہو گیا۔ کیش نے اسی گھر کے سامنے ایک بیٹھ کے نیچے بیٹھ کر ”Ode to a nightingale“ لکھی تھی۔ ہم نے بھی کچھ دیر اس بیٹھ کے نیچے بیٹھ کر کیش کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کیش کے بیٹھنے کے کمرہ کو جوں کا توں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی کتابیں، اس کے خطوط قریبے سے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر کمرہ میں کیش کے کچھ ہوئے بال رکھے ہوئے ہیں۔ حمایت اللہ نے مختلف کروں میں رکھے ہوئے کیش کے بالوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ بال کیش کے نہیں ہیں کیونکہ ایک کمرہ میں رکھے ہوئے بالوں کا رنگ دہرے کمرہ میں رکھے ہوئے بالوں سے مختلف ہے۔ ہم نے کہا ” ہو سکتا ہے بچپن میں کیش کے بالوں کا رنگ مختلف ہو اور نوجوانی میں ان کا رنگ بدل گیا ہو۔“ حمایت اللہ بار بار اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرتے

جاتے تھے اور کہتے تھے نہیں یہ بال کیش کے نہیں ہیں۔ جتنا ہم انہیں کیش کی شاعری کی طرف لا چاہتے تھے اتنا ہی وہ کیش کی زلف گرد گیر کے اسی پر ہوتے جاتے تھے۔

پھر ساقی ہمیں اسی علاقہ میں دلیل آف ہیلتھ لے گئے۔ جہاں ۱۹۱۲ء میں رابنڈن اٹھ یونیور نے قیام کیا تھا۔ یہیں پاس میں ایک مکان بھی نظر آیا جس میں ۱۹۱۵ء میں ڈی. ایچ. لارس مقیم ہوئے تھے۔ ان مکانوں پر ان اولیٰ شخصیتوں کے نام اور ان کے قیام کا زمانہ لکھا ہوا ہے۔

پھر ساقی ہمیں ہسپنیڈ سے تریب ہی ایک پب (Pub) میں لے گئے جس کے بارے میں بتایا کہ یہ چارلس ڈیکنس کا پسندیدہ پب (Pub) تھا۔ وہ اکثر یہاں بیٹھا کرتے تھے۔

ہم نے کہا ”ساقی! ہمیں لندن آئے ہوئے چدرہ دن ہو گئے۔ ہمیں آج تک کوئی ایسا پب نہیں ملا جس میں ہم بیٹھ سکیں۔ ہر پب کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس میں تو فلاں اور یہ بیٹھا کرنا تھا۔ چارلس ڈیکنس نے تو ہوں میں بیٹھنے کی انتہا کر دی۔ جس کسی پب میں جاؤ، پتہ چلتا ہے کہ یہاں چارلس ڈیکنس صاحب بیٹھ چکے ہیں۔ سلوں اسکواز میں ہمارڈشا کا پب بھی دیکھا۔ سارے پب کو ہمارڈشا کی تصویریں کے ذریعے ڈراوما بنادیا گیا ہے۔ ہم تو تھوڑی دریبھی وہاں نہ بیٹھ سکتے۔ وہاں سے اٹھ کر ماربر و آرم斯 کے پب میں گئے تو پتہ چلا کہ وہاں چارلس ڈیکنس کے علاوہ درجینا اولف اور کارل مارکس وغیرہ بھی بیٹھا کرتے تھے۔“

ساقی نے کہا ”اب تم تھک گئے ہو۔ پچھہ دری چارلس ڈیکنس کے پب میں بیٹھو۔ اوس نہ ہوا۔ ہم تمہارے لئے ایک الگ پب بنادیں گے۔“

چارلس ڈیکنس کے پب سے نکل کر ہم کین وڈگارڈس میں گئے۔ بڑی پر نفا جگہ ہے۔ ایک خوبصورت جھیل بھی اس باغ میں ہے جس کے کنارے گرمیوں کے موسم میں موسمی کی بڑی مخلیں آرستہ کی جاتی ہیں۔ باغ کے ایک کوشہ میں ڈاکٹر جانس (ڈکشنری والے) کا "Summer House" "گرمائی گھر" بھی موجود ہے۔ بالکل واہیات جگہ ہے۔ لکڑی کا بنایا ہوا ہے۔ دور سے جھونپڑی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ تریب جا کے دیکھا تو یہ اتنا چھوٹا ہے کہ ڈاکٹر

جانسن کی ڈاکٹرنیوں کے اگر دس بارہ نئے اس میں رکھ دینے جائیں تو ڈاکٹر جانسن کو اندر داخل ہونے کی جگہ نہ ملے۔ باسویل بھی ڈاکٹر جانسن سے ملنے اس ”گرمائی گھر“ میں آتا ہو گا تو باہر ہی سے بات کر کے پلا جانا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اس زمانے میں ڈاکٹرنی مرتب کرنے کے لئے ایسے ہی گھر میں رہنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم ڈاکٹر جانسن کے گھر سے مايوں ہوئے تو ساقی نے کہا ”فکر نہ کرو، اب میں تمہیں لندن کے ایک مشہور شاعر کے گھر لے چلتا ہوں۔“ اور پچھہ دیر بعد ہم ساقی فاروقی کے گھر میں تھے۔ ساقی کہنے لگے ”یہاں اردو کا ایک مشہور شاعر رہتا تھا ساقی فاروقی۔ کئی سو مرس پہلے پاکستان سے لندن آیا تھا۔ اس نے یہیں ”پیاس کا صحراء“ لکھا۔ یہیں اس نے ”زادار“ اور ”رازوں سے بھرا بستہ“ لکھا۔ حمایت اللہ نے بات کو کاشتے ہوئے اور اپنی چند یا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”میں پہلے ساقی فاروقی کے کئے ہوئے بال دکھائیں جو ضرور کسی فیبا میں محفوظ رکھے گئے ہوں گے۔“

اور ہم نے کہا ”بالوں کو مار دینے کوئی۔ ہم نے نا ہے کہ ساقی فاروقی نے نہ صرف اپنی شاعری میں بلکہ اپنے گھر میں بھی کتے، بیان، پچھوئے، مینڈک اور طو طے پال رکھے ہیں۔ ان کا بہت شہرہ سن رکھا ہے۔ ان کی بھی پچھلائیاں دکھاؤ۔“

ساقی نے ایک لمبی آدھر کر کہا ”یا رجھتی ایتم نے کیا دولا دیا۔ میں نے جتنے پا تو جانور اور پرندے پال رکھے تھے وہ سب مر کھپ گئے۔ طو طے کوئی نے کھایا، پچھوئے کوکتا کھا گیا۔ پھر کتنا طبعی موت مر گیا۔“ پھر ایک لمبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ”ساری بیان مر گئیں۔ اب یہ ایک لمبی رو گئی ہے سو وہ بھی خوش ہے۔“

ڈاکٹر مغنی قبسم کو ساقی کی لمبی کی تھائی پر رحم آگیا تو وہ سیٹی بجا تے ہوئے اس کے پیچھے بھاگنے لگے اور ہم نے مغنی قبسم کو سمجھایا ”مغنی صاحب! یہ انگریزی لمبی ہے۔ آپ اردو میں سیٹی بجا میں گئے تو اس کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا؟“

ساقی پرستور اپنے مر حوم پچھوئے کی یاد میں سرجھ کائے جیٹھے تھے۔ بولے ”میرے ذہن میں

ایک آئندیا آیا ہے۔ اب میں اس گھر کے آگے ایک تختی لگاؤں کا جس پر لکھا ہو گا یہی وہ گھر ہے جس میں فلاں سمنہ میں ایک پھوار ہتا تھا، نام تھا اس کا.....”
اور ہم نے کہا ”اور انگریز سچ مجھ اس مکان کو دیکھنے دور دور سے آیا کریں گے۔“ اس پر ساتی
نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔



کچھ حال مشاق احمد یوسفی

سے ملاقات کا

صاحبہم پہلے لکھے ہیں کہ لندن میں ہمیں یہاں کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے علاوہ مشاق احمد یوسفی کو بھی دیکھنا تھا۔ سو انہیں بھی دیکھ لیا۔ ہماری اور آپ عی کی طرح کے آدمی ہیں اور کوئی خاص بات نہیں۔ ہم تو انہیں ٹرفللگار اسکواز، برنس میوزیم کو دیکھنے سے پہلے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہماری اس عجلت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی تحریر وں سے ہم نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ یہ لندن کی سب سے قدیم عمارت ہیں۔ مگر جب انہیں دیکھ لیا تو احساس ہوا کہ یہ بکہ بین ان سے یقیناً پرانی ہے بلکہ ان سے دو ایک ملاتاتوں میں تو خود ہم بھی ان سے پرانے لگے۔ جو لوگ مشاق احمد یوسفی سے ملنے کے خواہشند ہیں انہیں ہم آگاہ کئے دیتے ہیں کہ ان کے لکھے پر بالکل نہ جائیں۔ یہاں مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کے قول فعل پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی "زرگزشت"، "خاکم بدہن" اور "چپائٹے" کو پڑھ کر ہم نے اپنے تھیس یہ سوچ رکھا تھا کہ یہ عمارت تو اب کھنڈر بن گئی ہوگی۔ سو چا تھا کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو عموماً تاریخی عمارتوں کے ساتھ کرتے چلے آئے ہیں یعنی ہاتھ لگائے بغیر دور سے دیکھ لیا۔ کچھ طرزِ تعمیر کی تعریف کی، کچھ بچپے کچھے آثار اور نقش و نگار کو دیکھ کر اصل عمارت کی عظمت کا نقشہ ذہن میں نازہ کر لیا۔ ایک فوٹو کھینچ لیا۔ کوئی ملاحظہ نہ دیکھ رہا ہو تو عمارت پر اپنا نام بھی کندہ کر دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بہت ہوا تو جاتے جاتے عمارت پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے یہ صرع جڑ دیا۔

آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی

ان کی تحریروں میں ان کی انوکھی بیماریوں کا حال پڑھ کھاتھا بلکہ ہمیں تو یہ بھی گمان تھا کہ موصوف تصنیف و تالیف کا بیشتر کام اپتال میں انجام دیتے ہیں۔ ان کی تھیڈ میں ایک بارہم بھی بڑی کوشش اور جستجو کے بعد بیمار پڑ کر اپتال گئے تھے کہ وہاں جا کر مزاح نگاری کریں گے۔ مزاح نگاری ہم سے نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے جبکہ ڈاکٹروں نے ہمیں مزاح نگاری کرنے سے منع کیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ڈاکٹروں کو ہماری صحت کی پرواہ تھی بلکہ اس لئے کہ ڈاکٹروں کو اصل میں ہمارے قارئین کی صحت کی زیادہ فکر تھی۔ ہم نے ڈاکٹروں کو بہتیرا سمجھایا کہ بھیتا ہماری بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ ہم تو آپ کے اپتال میں مزاح نگاری کرنے آئے ہیں۔ سنا ہے جو مزاح نگاری اپتال میں ہوتی ہے وہ کہیں اور نہیں ہوتی۔ ہماری اس بات کو سن کر کچھ ڈاکٹروں نے ہمیں امراض و ماغی کے اپتال میں منتقل کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ جب ڈاکٹر ہمارے اصل مرض کو سمجھنے سے قاصر رہے تو مشتاق احمد یوسفی کی بھی مثال پیش کی کہ ہمارے حبابوں موصوف کا بیشتر ادب عالیہ اپتال میں ہی پیدا ہوا ہے اور اندر یہ ہے کہ آگے بھی وہیں پیدا ہونا رہے گا۔ سو ہمیں بھی اپتال میں صحت مندا ادب اور غیر صحت مندا پچے پیدا کرنے کی اجازت دیجئے مگر مشکل یہ پیش آئی کہ مشتاق احمد یوسفی کے بعد ارد و مزاح نگاری نے تو بہت ترقی کر لی ہے لیکن علم طب نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ ڈاکٹر لوگ ہماری بات کا مطلب سمجھتے۔ لہذا اطب کے ڈاکٹروں نے ہمیں اپتال سے اور ادب کے ڈاکٹروں نے ادب سے خارج کر دیا۔ اس پس منظر کے ساتھ ہم مشتاق احمد یوسفی سے ملنے گئے تو ہم نے ان کی تحریروں کو کم اور ان کی بیماریوں کو زیادہ اپنے پیش نظر رکھا تھا بلکہ پچھی بات تو یہ ہے کہ ان کے بے لوث بھی خواہ ہونے کے لئے دلی سے چلتے وقت ایک طبیب حاذق سے ان کی بعض "مطبوعہ بیماریوں" کے علاج کے لئے کچھ غیر مطبوعہ نئے بھی حاصل کئے تھے۔ ان نسخوں کو ہم نے کس مشکل سے حاصل کیا تھا اس کا حال آپ کو کیا بتائیں۔ ہم نے حکیم صاحب نذکور کو یوسفی کی کتابیں دے کر کہا تھا کہ ان کی کتابوں میں مندرجہ بیماریوں کا حال احوال آپ پڑھیں۔ مرض کی تشخیص کریں اور کچھ نئے، جو بقول آپ کے تیر بہدف ہوتے ہیں تجویز کریں۔ ہم لندن جا رہے ہیں تو یوسفی صاحب کو دے

آنیل گے کہ اردو ادب اور مشاہق احمد یوسفی دونوں کا بھلا ہو۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے پاس ہم جب بھی مشاہق احمد یوسفی کے لئے موعودہ نسخے حاصل کرنے کے لیے گئے تو موصوف کا حال ہی جداگانہ تھا۔ بات کم کرتے تھے اور منتهی زیادہ تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ”بھائی رسول سے قبض کی شکایت تھی۔ چرا غلط کو پڑھنے بعد یہ جاتی رہی۔“ ہم نے جی ہی جی میں کہا چرا غلطے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔ دوسری بار گئے تو ان کی بھی کا والیوم پکھہ زیادہ ہی برداشت ہوا تھا۔ ہم نے موعودہ نسخہ مانگا تو مٹھھا مار کر بولے ”ابھی تو یوسفی کی بیماریوں سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ ماشاء اللہ خاصی دلچسپ، شکفتہ اور صحت مند بیماریاں ہیں۔ ابھی تو تشخیص کی نوبت نہیں آئی۔ تمہیں تو ابھی بہت دنوں بعد لندن جانا ہے۔“ طمینان سے نسخے لے لیا اور ہاں خاکم بدھن میں نے پڑھلی ہے۔ برڈی مفرح کتاب ہے۔ رسول سے بلڈ پریشر برداشت ہوا تھا وہ خاکم بدھن کے استعمال سے معتدل ہو گیا۔ ہم نے کہا ”بھائی ہم اپنا نسخہ نہ دیجئے خاکم بدھن کا نسخہ تو وہیں کر دیجئے۔“

بولے ”ایک مریض کو اشتہر سے پہلے پڑھنے کو دیا ہے۔“

”اور چرا غلطے کا نسخہ؟“ ہم نے پوچھا۔

بولے ”ایک اور مریض کورات میں دوڑھ پینے کے بعد اور سونے سے پہلے پڑھنے کے لیے دیا ہے۔“

ہم تیری مرتبہ پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نازہ نازہ نسل سے قارغہ ہو کر بیٹھے تھے۔ چہرے پر بیاشت، شرارۃ اور حرارت تینوں کے ملے جلے آہار نمایاں تھے۔ ہم نے نازلیا کر موصوف یوسفی کی ”زگزشت“ اور اپنی ”زن گزشت“ دونوں کوٹھکانے لگا کر بیٹھے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اپنے مطب کے ایک گوشے میں لے گئے اور رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے ”بھیسا اتمہارے پاس یوسفی کی اور کتنی کتابیں ہیں۔ سبحان اللہ! کیا مقوی کتابیں ہیں۔“ پھر آنکھ مار کر بولے ”پہلے تو میں اپنے طور پر ان کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اب تمہاری بھا بھی کے حکم کی قبیل میں پڑھ رہا ہوں۔ بخدا کوئی ان کتابوں کو ڈھنگ سے پڑھ لے تو“ اشہاری بیماریوں“

سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جائے۔ میان لندن میں اگر یونیورسٹی سے واقعی تمہاری ملاقات ہو تو یہ ضرور پوچھتے آتا کہ انہوں نے اپنی راجح وقت یہاں یوں کو کب، کہاں اور کیسے حاصل کیا تھا۔ میں بھی ان یہاں یوں میں بتتا ہوا چاہتا ہوں۔ یہاں یوں کے طبقہ کا پتہ ضرور لیتے آتا، بھولنا مت۔ میں نے کئی اور مریضوں کو بد رضا و غربت ان یہاں یوں میں بتتا ہونے کے لئے آمادہ کر رکھا ہے۔“

غرض مشاہق احمد یونیورسٹی سے طلبے ان کے تعلق سے ہمارا ذہن پس منظر پہنچا۔ لندن پہنچتے ہی افتخار عارف سے کہا ”بھتیا! بھتی ہمارے اعزاز میں اردو مرکز کا جلسہ نہ کرو۔ جلوں سے ہم یوں بھی دور بھاگتے ہیں مگر مشاہق احمد یونیورسٹی سے ہماری ملاقات تو کرو۔ ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں اور موقع ملے تو مراج پر سی بھی کرنا چاہتے ہیں۔“

افتخار عارف نے کہا ”سو تو ہو جائے گی، فکر نہ کرو۔“

ہم نے پوچھا ”ان دونوں یونیورسٹی صاحب کہاں قیام کرتے ہیں؟ گھر پر رہتے ہیں یا اس بستور اسپتال میں داخل ہیں؟“

افتخار عارف بولے ”نہیں بھتیا! اس وقت تو اپنے فتر میں فرانس منصی سے عبده مر آہور ہے ہوں گے۔ کہو تو نون پر ابھی تمہاری کتابات کرائے دیتے ہیں۔“

ہم نے افتخار عارف کو ٹوکتے ہوئے کہا ”یا راتاں تین ہزار عمارتوں سے اس طرح نون پر بات نہیں کرتے۔ ہم خود انہیں دیکھنے چلیں گے۔ تم ان سے ملاقات کا وقت طے کر لیں۔“

ہمیں لندن آئے ہوئے چوتھا دن تھا۔ پھرلی رات ساقی فاروقی کے ساتھ گذری تھی۔ لہذاں ہمیں میں جلدی بیدار ہوا تا نونا اور عملہ ممنوع تھا۔ ابھی ہم بستری میں تھے کہ افتخار عارف کا نون آیا۔ ”یونیورسٹی صاحب نے کل تمہیں اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے۔ کل کی شام خالی رکھو۔“

ہم نے حیرت سے پوچھا ”کیا یونیورسٹی صاحب بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے؟“

افتخار عارف نے کہا ”جان من! تم عجیب بکری ہو۔ دعوت ان کے گھر پر ہو رہی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے تو کیا تمہیں اچھوتوں کی طرح الگ بٹھا کر کھائیں گے؟“

ہم نے کہا ”نہیں یار ابادت ایسی نہیں ہے۔ یوسفی صاحب غالباً پرہیزی کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے اسر وہ کا حال ہم نے پڑھا ہے۔ خدا نخواستہ ہماری وجہ سے بد پرہیزی ہو جائے اور وہ اپنا جا کر کہیں مراح کی ایک اور کتاب نہ لکھ دیں۔“

انتخار عارف نے کہا ”تمہیں شاید نہیں معلوم کہ وہ بد پرہیزی سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔“

انتخار عارف کے نون کے بعد ہم بستر سے اٹھنے کی سوچ علی رہے تھے کہ گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آواز آئی ”میں مشاق احمد یوسفی بول رہا ہوں۔ کیا بھتی حسین تشریف رکھتے ہیں؟“

ہم نے اچانک اپنی آواز کو بدل کر کہا ”میں ہاں تشریف رکھتے ہیں۔ مگر درے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔ بھی بلائے دیتے ہیں۔ آپ انتظار کریں۔“

ہم نے بستر سے اٹھ کر ایک بھر پور انگڑائی لی۔ سر کوز در سے جھنکا۔ گلنے کو صاف کیا۔ قیص کے بنی ٹھیک سے لگائے اور اپنی اصلی آواز میں بولے ”السلام علیکم یوسفی صاحب! ہم تو آپ کی آواز سننے کو ترس گئے تھے۔ لندن آئے ہوئے چاروں ہو گئے مگر اب تک آپ کے دیدار نہ ہو سکے۔ آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کا مرد اشتیاق ہے۔“

بولے ”یہ اشتیاق یک طرف نہیں دو طرف ہے۔ میں بھی آپ سے ملنے کا مشاق ہوں۔“

ہم نے کہا ”آپ تو صرف مشاق ہیں۔ میں تو سر امر مشاق احمد یوسفی ہوں۔“

آخر کوپے محبوب لویب سے پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ سو ہم نے میلی فوٹی بات چیت کو بھی ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور گلنے کی تحریروں کی تعریف کرنے۔ بولے ”یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ اس وقت میں نے آپ کو یہ تانے کے لئے فون کیا ہے کہ کل رات کا کھانا آپ ہمارے گھر کھائیں گے۔“

نون کا ریسیور رکھنے کے بعد، میں ۱۹۶۲ء کی سر دیوں کے وہ دن یا دو آگئے جب حیدر آباد میں مشاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب ”چراغ تی“ کا ایک نسخہ ایک حیدر آبادی خاتون کے پاس نہ جانے کہاں سے آگیا تھا۔ اس نسخے کے حصول کی خاطر ہر کوئی ان خاتون سے نہ صرف تربیب بلکہ ”معنتریب“ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم نے بھی موصوفہ سے تربیب ہونا چاہا مگر تربیب ہونے

والوں کی قطار اتنی بھی تھی کہ ماہیوں ہو کر لوٹ آئے۔ دروغ بزرگ دن راوی ایک مرحلہ پر موصوف کو یہ خوش نہیں بھی ہو گئی تھی کہ ان کے اطراف لوگوں کا یہ بھیر بھڑکان کے حسن چہاں سوز کے سبب سے ہے۔ یہ مراسران کا حسن زدنہیں حسن نہیں تھا۔ ہم زندگی بھروسہ بکھنے والوں کی نظر دیکھنے کا کاروبار کرتے رہے۔ لہذا موصوف کو زحمت دینے بغیر سلیمان اریب مرحوم سے کہ موصوف کے حلقة بگوشوں میں تھے اور یہ کہ ”چراغ تھے“ کا نامہ ایک دن کیلئے ان کے قبضہ قدرت میں آگیا تھا، ہم نے یہ نامہ بالجبر حاصل کیا اور راتوں رات اپنے ہانپہ سے اس کی تمنی کا پیاں ہانپ کروا لیں۔ ہم نے مشاق احمد یوسفی کی ”چراغ تھے“ کو اسی ہانپ شدہ حالت میں پڑھا تھا۔ ہانپ کی بے شمار غلطیوں کے باوجودہ میں یہ کتاب بے حد پسند آئی تھی۔ انہی دنوں کی بات ہے ہم نے یوسفی کے تین اپنی عقیدت کے جوش میں یہ بھی لکھ دیا کہ ”یوسفی کو پڑھ کر آپ پٹرس اور رشید احمد صدیقی کو الگ الگ پڑھنے کی زحمت سے فجع جاتے ہیں۔“ اب کے کچھ ڈاکٹروں کو یہ بات ماگوار گذری تھی مگر ہم اب بھی اپنی رائے پر تائماں ہیں۔ چنانچہ جب ہمارا مجی رشید احمد صدیقی کو پڑھنے کو چاہتا ہے تو مشاق احمد یوسفی کو پڑھ لیتے ہیں۔ پٹرس کو پڑھنے کو جو مچلے تو مشاق احمد یوسفی کو پڑھ لیتے ہیں۔ حد تو یہ کہ اگر کبھی مشاق احمد یوسفی کو پڑھنے کو دل چاہے تو تب بھی مشاق احمد یوسفی عی کو پڑھ لیتے ہیں۔

غرض دوسری شام کو مرکزی لندن کے ایک خوبصورت فلیٹ میں ہم مشاق احمد یوسفی سے ملے۔ ماشاء اللہ اتنے صحت مند نظر آئے کہ ان کی مزاج پری کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ سجا سجا یا خوبصورت، وسیع اور کشاور فلیٹ ہے۔ ”زرگزشت“ والے مشاق احمد یوسفی جو اینڈرنس کے حضور میں جاتے ہوئے اپنی پتلون کے پیوند کو فائیل سے ڈھک لیتے تھے۔ ”چراغ تھے“ والے مشاق احمد یوسفی جن کی عینک لگا کر پچے انداھا بھیسے کا کھیل کھیلا کرتے تھے اور خان سیف الملوك کی سائیکل کے کیری پر بیٹھ کر جانے والے مشاق احمد یوسفی میں اس فلیٹ میں نہیں ملے۔ ”زرگزشت“ میں ان کے حالات زندگی اچھے نہیں تھے۔ اب ”حالت زندگی“ اچھی ہے۔ اصل اہمیت حالات کی نہیں حالت کی ہوتی ہے۔ بہت تپاک سے ملے۔ مرنجان مرننج، کم آمیز، کم کو اور

اپنے آپ میں سائے ہوئے۔ اس رات ان کی کم کوئی کی ایک وجہ غالباً یہ بھی رعنی ہو کہ محترمہ ماہ طلعت عابدی اور انتشار عارف کی نوک جھونک کچھ اس زور و شور سے جاری تھی کہ اچھا خاصاً زوکو آدمی بھی خود و بخود کم کو بن جائے۔ یوں بھی یوسفی اپنی کم آہیزی اور کوششی کے لئے خاصے بدنا میں۔ کوششی کا یہ عالم ہے کہ رسالوں میں اپنی تصویر یہک نہیں چھپواتے کہ کہیں کسی ماحرم کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ سال میں ایک بار کسی اولیٰ محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے محفلوں میں شرکت کرنے کا اپنا یہ مدد و دکوہ ختم کر چکے تھے۔ ہم نے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اس سال اکتوبر یا نومبر میں ہندوستان آنے کا وعدہ ہم سے کر چکے ہیں مگر شرط دی ہے کہ جلسہ ایک ہی ہوگا۔ دوسرا جلسہ کروانا ہوتا گلے سال پھر ہندوستان بلائیں۔ ہم نے ان کی شرط مان لی ہے اور وعدہ کر لیا ہے کہ ان کا ایک جلسہ حیدر آباد میں ہوگا۔ البتہ دوسرے شہروں میں صرف جلوس لٹکیں گے۔ ہم نے اتنا قانون تو پڑھا ہی ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کر سکیں۔ ہم نے ان سے یہ وعدہ انتشار عارف، نقیٰ تنوری، رضا حسن عابدی اور ڈاکٹر فضیاء الدین ٹکلیب کی موجودگی میں لیا ہے۔ اب آپ کو بھی کواہوں میں شامل کر لیتے ہیں۔

ہم نے یوسفی سے کہا ”زرگزشت“ کے بعد آپ کی کوئی تصنیف نہیں آئی۔ اب تو آپ کے حالات زندگی ”زرگزشت“ سے آگے نکل گئے ہیں۔ لہذا اب ”زرگزشت“ کو بھی آگے پڑھنا چاہئے۔ ”بولے“ میری ایک کتاب آرعنی ہے۔ مگر کب آئے گی میں خود نہیں جانتا۔ سنا ہے کہ کتابت ہورعنی ہے۔ ایک نہ ایک دن چھپ کر آجائے گی۔ ”یوسفی جس اہتمام سے لکھتے ہیں اور جس اہتمام سے اپنی کتابیں چھپواتے ہیں، یہ انہی کا حصہ ہے۔

ہم سے بولے ”آپ جس طرح لکھتے ہیں اور جتنا لکھتے ہیں۔ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔“

ہم نے کہا ”یوسفی صاحب! کچھ پوچھئے تو ہم جس طرح لکھتے ہیں اور جتنا لکھتے ہیں، اس کے لئے ہمت کی نہیں دیکھ دیں ہ ولیم زوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چہاب ہمیں احساس ہتا ہے کہ ہمیں لکھنلا لکل نہیں آتا مگر کیا کریں اپنے ملک میں مشہور جو ہو گئے ہیں۔ لوگ زردی لکھواتے ہیں۔“

انختار عارف نے کہا ”یوسفی صاحب اپنے معیار کے معاملے میں اتنے سخت واقع ہوئے ہیں کہ ایک بار انہوں نے اپنا ایک مضمون ایک رسالہ کو بغرض اشاعت روانہ کیا۔ رسالہ چھپ کر آگیا تو یوسفی صاحب کو احساس ہوا کہ مضمون ان کے معیار پر پورا نہیں تر رہا ہے۔ لہذا بازار گئے۔ رسالہ کی ساری کا پیاں خریدیں اور انہیں خود اپنے ہاتھوں سند رائٹش کر دیا۔“

ہم نے کہا ”یا رانختارا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ معیار کے معاملہ میں ہمارا بھی یہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جن رسالوں میں ہمارے مضامین چھپتے ہیں انہیں ہم خود نہیں جلاتے بلکہ ہمارے پڑھنے والے جلا دیتے ہیں۔ بات تو ایک ہی ہوتی۔“

معیار کی ممائت سے ہٹ کر ایک اور معاملہ میں بھی یوسفی ہم سے مشابہہ نظر آئے یعنی ہماری طرح ان میں بھی یہ اچھی عادت ہے کہ کسی کے خط کا جواب نہیں دیتے۔ سنا ہے کہ ایک محقق ان پر رسروچ کر رہے ہیں۔ وہ صاحب یوسفی سے ان کے حالات زندگی مانگتے ہیں، یہ انہیں نہیں دیتے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان محقق صاحب نے یوسفی کو حصکی دی ہے کہ اگر اندر وون ایک ماہ وہ اپنے حالات انہیں روانہ نہ کریں گے تو وہ فلاں صاحب (جن کا نام ہم ظاہر کرنے نہیں چاہتے) کے حالات زندگی کو یوسفی سے منسوب کر دیں گے۔ آگے آگے دیکھنے ہوتا ہے کیا۔

یوسفی سے اس رات بہت سی باتیں ہوئیں۔ ہم نے پوچھا ”یوسفی صاحب! آخر اس کی کیا ہے ہے کہ پاکستان میں فوجی مزاج نگاروں کی بہتات ہے۔ ہر فوجی بندوق اٹھائے، شگین نا نے مزاج کے میدان میں گھس آتا ہے اور سورچہ سنہجات لینا ہے۔ کرنل شفیق الرحمن، کرنل محمد خاں، میجر صدیق سالک اور میجر ضمیر جعفری کتنے نام گناہیں۔ ہمیں تو آپ کے اور مشفیق خوبیہ کے سوائے کوئی سو لیٹین مزاج نگار نظر نہیں آتا۔“

مشاق احمد یوسفی نے ہمارے اس سوال کے جواب میں کہا ”چلنے کھانا لگ گیا ہے، کہیں ٹھنڈا نہ ہو جائے۔“

ای طرح کا ایک اور سوال پوچھا تو بولے ”چلنے آئیں کریم لگ گئی ہے۔ کہیں گرم نہ ہو جائے۔“

غرض ایسی عی و لچپ دلچپ اور خلائقہ خلائقہ با تم ہوتی رہیں۔

جب مغرب میں مزاح نگاری کا ذکر آیا تو بولے ”جارج میکاش کا کہنا ہے کہ مغرب میں مزاح کب کام رچنا ہے اور میں اس کی رائے سے متفق ہوں۔“

ہم نے کہا ”یوسفی صاحب اچ تو یہ ہے کہ مشرق میں بھی مزاح مر رہا ہے لیکن آپ اسے مرنے نہیں دے رہے ہیں حالانکہ ہمارے کئی مزاح نگار سے یہ نیاں رگڑا رگڑا کر مانا چاہتے ہیں۔“
ہمارے اس تبصرہ پر بولے ”لبجھے، چائے آگئی ہے۔ چائے جیجھے۔“

صاحب اچ تو یہ حال احوال ہے مشاہق احمد یوسفی سے ہماری ملاقاتات کا۔ اب آگے سن کر کیا سمجھے گا۔ باقی ملاقاتات بھی ایسی عی ہوئی۔ تاہم اس ملاقاتات کے نابوتوں میں آخری کیل خونکنے کی غرض سے اتنا اور عرض کرتے چلیں کہ جب ہم جانے لگے تو یوسفی دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ ہمارا اور کوٹ ہمگر سے اتا را اور ہمیں پہنانے لگے۔ ہم نے نا، نا کی گرفتہ مانے۔ نتیجہ میں ہمارا ہاتھ ان کے ٹیلی فون کے رسیور سے جو دیوار سے انک رہا تھا انکرا گیا۔ رسیور نیچے گرا تو ہم نے معدودت کی۔ بولے ”ارے نہیں! اس میں معدودت کی کیا بات ہے؟“

ہم نے جوبات یوسفی کو نہیں بتائی وہ اب آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر ان کے ٹیلی فون کے رسیور کو گرا لایا تھا تاکہ وہ اس بہانے ہمیں یا درکھنکیں ورنہ ہمیں یا درکھنے کی ان کے پاس کوئی معقول وجہی تونہ رہ جاتی۔ ان کے گھر سے باہر نکل آئے تو لندن کی سڑکوں پر بوندا باندی ہو رہی تھی اور بلکہ سی دھنڈ پھیل رہی تھی۔ ہمیں نہ جانے کیوں اصغر کوڈڑوی کا ایک گنمam سا شعر یاد آگیا جسے ہم نے زمانہ طالب علمی کے میں پڑھا تھا۔ آپ بھی سن لبجھے۔

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نہیاں ہے



سچھنگی تنویر کے بارے میں

تمیں سال پہلے میں اور نئی تنویر چاودر گھاٹ پل سے تریب موی ندی کے کنارے ایک ریستوران میں بیٹھا کرتے تھے اور تمدن پہلے میں اور نئی تنویر ویسٹ فنڈر سے تریب دریائے شمز کے کنارے ایک جہازی ریستوران میں بیٹھے لندن کی جگہاتی روشنیوں سے پرے کچھ دیکھنے، کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان تمیں مر سوں میں ویسٹ فنڈر کے پل کے نیچے دریائے شمز میں نہ جانے کتنا پانی بہہ گیا ہوگا۔ انگریزی محاورے سے کچھ زیادہ بہہ گیا ہوگا اور ادھر موی ندی چونکہ انگریزی نہیں جانتی اس لئے بہتی کم ہے اور بنہے کی ادا کاری زیادہ کرتی ہے۔ چاودر گھاٹ کے پل کے نیچے موی ندی نہ جانے کب سے رکی کھڑی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

ٹھہرا ہوا دریا ہوں، بڑی دیر سے چپ ہوں

میں نے اس ٹھہرے ہوئے دریا کی سطح پر یادوں کی کنگری پھینکتے ہوئے کہا ”یار نئی! اکتنی عجیب بات ہے۔ تمیں مر س پہلے جب ہم چاودر گھاٹ پل کے اس ریستوران میں بیٹھا کرتے تھے تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن ہم ہزاروں میل دور دریائے شمز کے کنارے اپنی پیٹھوں پر تمیں مر س کے بیٹھے ہوئے وقت کی گھری لادے آن بیٹھیں گے تا کہ تم اپنے وقت کا حساب بتاؤ اور میں اپنے وقت کا حساب بتاؤ۔ پھر ہم دونوں مل کر دنیا کو بتا سیں۔“

دیکھو ہم نے کیسے برس کی اس آباد خرابی میں

اس شام نئی خاموش سارہا کیونکہ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ میں اسے پچھلے تمیں مر سوں سے

جانتا ہوں۔ وہ بھی موئی عدی کی طرح تھیرا ہوا دیا ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی جھوٹی میں زندگی کے تحریکات مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔

میں نے کہا ”یار نقی! دیکھو تو ویسٹ نشر کے اس پل سے لندن کس طرح جنمگار ہا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے میں برس پہلے کی موئی عدی اپنے حافظہ میں شمز سے زیادہ بڑی نظر آتی ہے۔ حیدر آباد لندن سے بڑا شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی روشنیاں جن کا اصل میں کوئی وجود نہیں تھا، لندن کی روشنیوں سے زیادہ روشن نظر آتی ہیں۔ حافظہ میں یہ ساری گزبرانہ جانے کس طرح ہو رہی ہے۔ اصل میں نوجوانی چیزیں ایسی ہوتی ہے۔ ہم اپنی نوجوانی کے پھیلے ہوئے پاٹ کو موئی عدی کے کے پاٹ سے جوڑ دیتے تھے۔ اپنے دلوں میں جملہ جملہ کرنے والی روشنیوں کو موئی عدی کے کنارے پر سجادیتے تھے۔ روشنی ہمارے اندر تھی شہر میں نہیں۔ دستت شہر میں نہیں ہمارے وجود میں تھی۔ میری اس بات پر نقی پھر بھی خاموش رہا کیونکہ پھیلے باہمیں برسوں میں اس نے شمز کے ساتھ گزارا کرنے کی عادت ڈال لی ہے۔ وہ دوسری دل کے نیچے اب ایک خاموش جزیرہ بن گیا ہے۔

مجھے اس وقت ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک خاتون اپنے بچوں کو اپنے الہم سے پرانی تصویریں دکھاری تھیں۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے ایک خوب رہا و جیہرہ و شکل نوجوان کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”انہیں دیکھو یہ تمہارے ڈیڈی ہیں۔“ اس پر سب سے چھوٹے بچے نے بڑے غور سے اس تصویر کو دیکھا اور کہا ”می! اگر یہ ہمارے ڈیڈی ہیں تو پھر وہ گنجنا اور کھوٹ کون ہے جو ہر دم گھر میں کھانستا رہتا ہے اور جسے ہم لوگ ان دنوں ڈیڈی کہتے ہیں۔“

تو صاحبو! آج میں اسی نقی تنویر کا حال بیان کرنے چلا ہوں جو آج سے تھیں برس پہلے مجھے لا تھا۔ وھان پان تو خیر وہ آج بھی ہے مگر ان دنوں کچھ زیادہ ہی وھان پان تھا۔ جون ۱۹۵۳ء میں جب میں گلبرگہ سے اسٹر میڈیسٹ کا امتحان پاس کر کے عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں داخلہ حاصل کرنے کی غرض سے حیدر آباد آیا تو دو چار دنوں میں یعنی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھ سے ایک سال سیئر تھا اور ابتداء ہی سے حیدر آباد میں مقیم تھا۔ ان دنوں جو طباء اضلاع سے حیدر آباد

آتے تھے ان کا سیمیر طلبہ اکٹھر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ابتداء میں نقی مجھے بھی Rural Talent کے سمجھا کرنا تھا مگر بہت جلد ہم دونوں نے مل کر دو چارا یسے Rural Talent کو علاش کر لیا جن کے سہارے یونیورسٹی کے دن نہ جانے کس طرح بیت گئے۔ ان دونوں عثمانیہ یونیورسٹی اردو و ماہول میں کمر کمر ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر دوسر اطالب علم شعر کہتا تھا اور چوتھا طالب علم انسانے لکھا کرنا تھا بلکہ انہیں دونوں عالمی اسنے کے موضوع پر اس کے ایک انسانے کوین الاقوامی انعام بھی ملا تھا۔ جہاں تک میر اعلق ہے میں نے ادبی مخلفوں میں ہونک کے ذریعہ ادب سے اپنا رشتہ بنائے رکھا تھا۔

گابر گہ کے زمانہ طالب علمی سے ہی میں آل حیدر آباد اسٹوڈیٹس یونیورسٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرنا تھا، جو باعث میں بازو کے خیالات کے حامل طباء کی انجمن تھی نقی سے ملاؤپتہ پلاک وہندہ صرف اس انجمن کی زلف گرد گیر کا اسیر ہے بلکہ بہت سی ان طالبات کی زلف ہائے گرد گیر کا اسیر ہے جن کا میں بھی اپنے کو اسیر سمجھتا تھا۔ بعد میں ”زلفوں“ کے معاملے میں ہم نے پر اس بقارے باہم کا معابدہ کر لیا تھا اور کبھی ہم دونوں کے درمیان اس معاملہ میں تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ آل حیدر آباد اسٹوڈیٹس یونیورسٹی کی سرگرمیوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ نقی یونیورسٹی کے کاموں میں بہت سمجھی گئی سے حصہ لیتا تھا۔ کیونکہ پارٹی کے ففتر بھی اس کا آنا جانا بہت ہوتا تھا۔ ہر ہنال ہو یا بھوک ہر ہنال، مظاہرے ہوں یا مبارحے، نقی سب میں پیش پیش رہتا تھا۔ ہمارے ایک دوست تھے اسد۔ اب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آل حیدر آباد اسٹوڈیٹس یونیورسٹی کے جزل سکریٹری تھے۔ ہمیشہ پیلے رنگ کا بش شرٹ پہن کرتے تھے مشہور تھا کہ موصوف نیند میں بھی انقلابی فریزے لگاتے تھے۔ جس کی کالج کے سامنے یہ پیلا بش شرٹ نظر آتا تھا طباء خود بخود کلاسوں سے غائب ہو جاتے تھے کہ ”چلو پیلا بش شرٹ آگیا ہے۔ کالج کی چھٹی۔“

نقی ہتنا سخیدہ نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی شریر اور چلبلا تھا۔ یہ صفت تو اس میں آج بھی ہے۔ نقی اگر چہ انسانے لکھتا تھا مگر کبھی کسی کو سنا نہیں تھا۔ میں نے تو کالج سے نکلنے کے کئی مرس بعد کھنڈا شروع کیا۔ لہذا نقی نے بڑی ہوشیاری سے کالج کے دو چارا یسے انسانہ نگاروں اور شاعروں کو ڈھونڈ

نکالا تھا جنہیں اپنی تخلیقات سنانے کا جنون تھا لئے ان کے جنون کی قیمت موصول کرنا خوب جانتا تھا۔ میں اس انسانہ نگار کا نام نہیں لوں گا۔ اب بھی ہندوستان میں حیات ہیں اور انسانے لکھ رہے ہیں۔ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دوسرے لوں تک ہماری ہولنگ کا سارا خرچ انسانہ نگار موصوف ہی برداشت کرتے تھے۔ دوسرے پورہ میں ایک خاص ہوں گا جہاں انسانہ نگار موصوف ہر شام انسانہ بدست آتے اور ہم دونوں فاقہ پر شکم دہاں پہنچتے۔ انسانہ سنانے سے پہلے تھی انسانہ نگار سے پوچھ لیتا تھا کہ انسانے کے انجام پر ہیر وہن زندہ رہے گی یا مر جائے گی۔ انسانہ نگار ہیر وہن کی متوقع وفات حضرت آیات کا مژدہ سنانا تو نتی کہتا "یا رب تمہارے انسانے میں ہیر وہن اس قدر کرب سے مرتی ہے کہ بھوکے پیٹ اس کرب کو برداشت کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلے کچھ کھلاو پلاو۔ ہم میں صبر جیل کا مادہ پیدا کر دیجھر ہیر وہن کو شوق سے بلاک کرنا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

پیچاہہ انسانہ نگار کھانے پینے کی چیزیں منگاتا۔ وہ انسانہ سنانا تو ہم انسانہ کم سنتے تھے اور ہیر وہن کے مرنے کا انتظار زیادہ کرتے تھے۔ وہ ہر روز ایک مہلک انسانہ لے کر آتا اور ہمیں غی زندگی عطا کر جاتا۔ اس کی ہیر وہن کی موت کے ساتھ ہم کچھ اور بھی زندہ ہو جاتے تھے۔ یوں بھی ہمیں انسانہ سنتے میں کچھ زیادہ رحمت نہیں اٹھائی پڑتی تھی کیونکہ ہمارے انسانہ نگار دوست لفظوں کی مدد سے نہیں بلکہ ڈیش Dashes کی مدد سے انسانہ لکھتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں انسانہ لکھنے کا رواج تھا۔ وہ انسانہ سناتے اور نتی سنتے سچ میں ڈیش (Dash) لگاتا تھا۔ کبھی کبھی میں نتی کا ہاتھ بٹانے کے لئے انسانہ نگار موصوف کے انسانے میں ڈیش (Dash) لگانے کی کوشش کرتا تو انسانہ نگار موصوف مجھے ٹوک دیتے کہ "یا رب تم ہمیشہ غلط جگہ ڈیش لگاتے ہو۔ تم انسانہ سنو نتی ڈیش لگاتا رہے گا۔"

ڈیڑھ دوسری بعد انسانہ نگار نے جب محسوس کیا کہ انسانہ میں ہیر وہنوں کی بلاکت اس کے لئے نقصان دہنا بہت ہو رہی ہے تو ایک دن وہ زندہ ہیر وہن کا انسانہ لے کر آگیا۔ بولا "آج میں

ایک زندہ ہیر و میں کا انسانہ لے کر آیا ہوں۔“

نقی نے کہا ”یارا پ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمیں تو اسے سیلبریٹ Celebrate کا چاہئے۔ اسی بات پر منگا دہمہ یا نی اور ڈبل کامیٹھا انسانہ سنانے سے پہلے۔“ اور انسانہ نگار کونقی کے حکم کی تعییں کرنی پڑی۔

جب انسانہ نگار موصوف نے دیکھا کہ ہیر و میں چاہے زندہ رہے یا مر جائے ان کی جیب پر کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا ہے تو انہوں نے ہماری اجازت کے بغیر ہیر و میںوں کو بلاک کرنا شروع کر دیا اور اب تک بڑے اہتمام سے بلاک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے بعد نقی نے ”پاک منی“ کے طور پر ایک اور انسانہ نگار کو چھاؤں لیا تھا۔

انسانہ نگار اور شاعر ہم سے خالق رہنے لگے تو ہم دونوں اپنا پیشہ بدل کر معاملات حسن و عشق کے خصوصی مشیر بن گئے۔ جو کوئی بھی عشق میں مبتلا ہوتا یا ہوا چاہتا تھا وہ ہم سے معاملات دل کے اسرار درموز جانے کے لئے آتا۔ نقی کو شاید یاد ہو گا کہ اس نے کئی دوستوں کی جانب سے ان کی محبوباوں کے نام محبت ناموں کے مسودے تیار کئے۔ دوستوں کی محبوباوں کے جواب آتے تو وہ ان جو بات کی روشنی میں نئے نئے محبت نامے رقم کرتا تھا۔ ان میں سے کئی محبتیں کامیاب بھی ہو گئیں اور اب خیر سے صاحب اولاد بھی ہیں۔ اس سلسلے میں میں اپنے مشترک دوست رام چندر را۔ گلگرنی کی مثال دینا چاہوں گا کہ موصوف اپنے نئنے واقع ہوئے تھے کہ محبت کرنے کے لئے کسی مناسب لڑکی کا انتخاب تک نہ کر سکتے تھے۔ ہم لوگ ہر روز ٹرین سے یونیورسٹی جایا کرتے تھے۔ ایک دن گلگرنی نے کہا ”یارا تم لوگ الگ الگ محبت کرتے ہو۔ میرا کوئی خیال نہیں کرتے۔ آخر میں بھی تو محبت کرنا چاہتا ہوں“۔ نقی نے کہا ”تم پہلے کسی لڑکی کا انتخاب کرو پھر ہم تمہاری محبت کے لئے زور لگاتے ہیں۔“ بولا ”یہی تو نہیں کر سکتا۔ یہ کام بھی تم دونوں کو کرنا ہوگا۔“ آخر دوست کس کام آئیں گے۔“ دو دن بعد میں نے اور نقی نے اس کے لئے ایک لڑکی کا انتخاب کیا جو اسی ٹرین سے سکندر آباد جایا کرتی تھی۔ گلگرنی نے لڑکی کو دیکھا تو بولا ”یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ مجھ سے کیونکر محبت کرے گی؟“ ہم نے کہا ”تم ہمارے تباہے ہوئے راستے پر چلتے رہو۔

انشاء اللہ کو ہر مقصود جائے گا۔“

اس کے بعد ہر شام لکرنی کو محبت کا درس دیا جانے لگا جسے وہ دوسرے دن صبح تک بھول جانا تھا۔ وہ ہم سے سیکھ کر تو بہت سچھ جاتا تھا مگر اس بتناز کے سامنے پہنچتا تو حرف مدعا اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ جب وہ ہماری تربیت پر عمل کرنے سے تاصلہ رہنے لگا تو نقی نے ایک دن اسے دھمکی دی کہ ”اگر تم اس لڑکی کے سامنے اظہار محبت نہیں کر سکتے تو پھر اس لڑکی سے دست بردار ہو جاؤ تاکہ ہم اس سے محبت کریں۔ بلا وجهہ ایک خوبصورت لڑکی کو ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔“ لکرنی پر اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ طے پایا کہ لکرنی کی طرف سے محبت نامہ اس لڑکی کے نام تیار کیا جائے جسے وہ دوسرے دن اس لڑکی کو تھادے گا۔ نقی نے محبت نامہ کا ایک زوردار مسودہ تیار کیا جس میں لکرنی نے اپنی بزدیلی کے مطابق سچھ ترمیم کرنی چاہی مگر نقی راضی نہ ہوا۔ لکرنی سے کہا گیا کہ وہ اس مسودہ کو فیر یعنی صاف کر کے لے آئے۔ مسودہ فیر ہو کر آیا تو دیکھا کہ اس میں جا بجا الملا کی غلطیاں ہیں۔ نقی نے اسے ڈائٹا کہ تم محبت نامہ کو صحیح طور پر نقل تک نہیں کر سکتے۔ محبت کیا خاک کرو گے۔ بالآخر نقی کی ہینڈر انٹنگ میں محبت نامہ تیار ہوا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ لکرنی اس محبت نامہ کو اس لڑکی کے حوالہ کرنے کے بعد چلتی ہرین سے کو دیکھا۔ لڑکی کویا تو لکرنی بھاگیا یا اس کی پیاوہ بھاگنی کر یہ سلسلہ یہاں سے جو آگے بڑھا تو وہ ڈرپوک اور بزدل لکرنی جس کی زبان اظہار محبت کرتے ہوئے لڑکھڑا جاتی تھی ایک دن اتنا مذر بن گیا کہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ بھالے گیا۔ لکرنی بہمن تھا اور وہ لڑکی اچھوت تھی۔ لکرنی اور اس لڑکی کے ارکان خاندان ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ بتاؤ یہ دونوں کہاں ہیں؟ ہم دونوں کو پتہ تھا کہ لکرنی کہاں ہے مگر نہ تو نقی نے اتنا پتہ بتایا اور نہ عی میں نے۔ بعد میں لکرنی نے جس کی بزدیلی کا دور دور تک شہر تھا اپنی بیوی کے لئے سماج سے وہ جگ کی کہ ہم سب دیکھتے رہ گئے۔ اگر نقی نے مذاق مذاق میں اسے مذہر نہ بٹایا ہوتا تو وہ آج اتنی خوش حال زندگی کیوں کر گز اتا۔ لکرنی اور مز لکرنی اب بھی بھی ملتے ہیں تو نقی کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نقی کے تحریر کردہ محبت ناموں نے کئی زندگیاں سنوار دیں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ نقی کے بعض محبت نامے خود اس کے کام نہ آ سکے۔

سب کے تو گریاں ہی ڈالے اپنا ہی گریاں بھول گئے

کانج سے نکلنے کے بعد، ہم لوگ اپنے اپنے راستوں پر چل پڑے مگر حیدر آباد کا "اور بھٹ ہوںگی" وہ چکھی جہاں ہم لوگ ہر شام لا کرتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ زندگی کا صحیح اور اک ہمیں اسی ہوںگی میں حاصل ہوا اور یہیں ہم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہوںگی کیا تھا ایک ایسا گھاٹ تھا جس پر ادیب، شاعر، مصور، سیاست داں، فلسفی سب ایک ساتھ چائے پینتے تھے۔ دنیا کے بہترین ادب سے ہم یہیں روشناس ہونے اور زندگی کے تعلق سے ایک سمجھدہ اور معتبر رویہ اپنایا۔ ڈاکٹر یوسف اور وقار لطیف سے یہیں ملاقات ہوئی۔ نقی نے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور میں صحافی کی حیثیت سے حیدر آباد کے روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہو گیا تھا۔

ان دونوں ہم لوگوں کے مزاج میں ایک عجیب ساختمان پیدا ہو گیا تھا جو زندگی کے تضادات کے اور اک سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگوں کی بنیادی خوبی و شرافت برقرار رکھی۔ نقی کی ایک خوبی مجھے ہمیشہ سے پسند رہی کہ جا گیر وار انہ گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اس نے زندگی کے لئے ہمیشہ ایک محنت مند اور ترقی پسند اونہ رویہ اپنایا۔ کانج سے نکلنے کے بعد، نقی نے چھ برس حیدر آباد میں گزارے۔ اس کی افسانہ نگاری کا شوق بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔

پھر ۱۹۶۱ء میں ایک دن نقی انگلستان کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے خطوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ وہاں کی مشکلات سے دوچار ہے۔ ہر خط میں اور بھٹ ہوںگی کا حال یوں پوچھتا تھا جیسے یہ اس کارثیتی دار ہو۔ ۱۹۶۹ء میں جب یہ ہوںگی ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تو اس نے مجھے ایک دردبردار پُر سے کاخط لکھا۔

۱۹۶۱ء کے بعد نقی سے بس چند ہی ملا تا تھیں ہوئی ہیں۔ پچھلے سال وہ میں الاقوامی فلمی میلہ میں شرکت کے لئے دہلی آیا تھا۔ دس بارہ دن خوب ملا تا تھیں رہیں۔ نقی نے بہ طائفی آکر انگریزی صحافت میں جو مقام حاصل کیا ہے اسے دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ دہلی کی تفصیلی ملا تا تھوں میں میں نے اندازہ لگایا کہ آج سے پچیس تھیں میں پہلے ہم دونوں نے زندگی کو دیکھنے، پر کھنے اور برستے

کے لئے جو زاویہ نگاہ اپنایا تھا وہ اب بھی ہم دونوں کے پاس محفوظ ہے۔ نجھے حیرت ہوتی ہے کہ لندن جیسے شہر میں اتنے برس گزارنے کے باوجود اس کا زاویہ نگاہ گرد آلو نہیں ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ زندگی گزارنے کے لئے زندگی کی نہیں بلکہ ایک زاویہ نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی زاویہ نگاہ سے میں موی عدی کو دیکھتا ہوں اور اسی زاویہ نگاہ سے نقی شیز کو دیکھتا ہے اور اب تو میں نے شیز کو بھی دیکھ لیا ہے۔ ۱۹۶۱ء سے پہلے لندن میرے لئے دیگر شہروں کی طرح ایک شہر تھا۔ مگر جب سے نقی اس شہر میں آباد ہوا ہے میں لندن کی ہر تبدیلی کا نقی کے پس منظر میں جائزہ لینا ہوں۔ مار گریٹ تھیٹ پھر سے بر راقدار آتی ہیں تو یہ سوچتا ہوں کہ اس سے نقی کا بھلا ہو گا یا نہیں۔ شہر عمارتوں سے نہیں بنتا، اس شخص سے بنتا ہے جو اس میں آباد ہونا ہے۔ پھر اس شہر میں میرا سب سے پیارا و مست رہتا ہے۔ اس کے حوالے سے اب شیز بھی اپنی لگتی ہے۔ ٹرال لگار اسکو از بھی اپنا لگتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بکشمگم میلیں بھی اپنا عی لگتا ہے۔ بھی میرا زاویہ نگاہ ہے اور یہی زاویہ نگاہ کا بھی ہے۔



پیرس میں مسرور خورشید

نے ہمیں مسرور کیا

آدمی یورپ جائے اور پیرس کونہ دیکھئے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگرہ جا کر وہاں کا پیٹھا تو کھا آئے لیکن تاج محل کونہ دیکھئے۔ ہم بھی بہت دنوں تک برطانیہ میں پیٹھا ہی کھاتے رہے۔ شہروں کا شہر پیرس یورپ کے چلچر کا مرکز ہے۔ اور ہم چلچر کے پاس ذرا دیر سے ہی جاتے ہیں۔ اماراج کی وہ ایک خلک شام تھی جب ہم لندن کے احباب کو خدا حافظ کہہ، لپنے کندھے پر جھولا ڈال کثری یہ انسین کے سامنے بس میں سوار ہو گئے۔ رات کو بوس کا یہ تافلہ لندن سے چلتا ہے اور دوسرے دن منہہ اندر ہرے پیرس پہنچ جانا ہے۔ آنے جانے کا کرایہ صرف ۲۸ روپڑ ہوتا ہے۔ بس میں سوار ہوتے ہی ہمیں احساس ہو گیا کہ ہم اچانک ایک غیر مانوس دنیا میں پہنچ گئے ہیں کیونکہ بس میں کوئی انگریزی بولنے والا دکھائی دینا تو دور کی بات ہے سنائی تک نہ دیتا تھا۔ اکثریت فرانسیسیوں کی تھی جو "غوغائ" کر رہے تھے۔ فرانسیسی اپنی بات چیت میں "غ" کا جتنا استعمال کرتے ہیں اتنا یورپ میں شاید ہی کوئی اور قوم کرتی ہو۔ تبھی تو چلچر کے معاملہ میں انہوں نے اتنی ترقی کی ہے۔ بس بڑی دیر تک لندن میں گھومتی رہی۔ پھر شہر سے باہر نکل گئی۔ تین گھنٹوں کے سفر کے بعد ہمیں یہ مژدہ سنایا گیا کہ ہم برطانیہ کی بندرگاہ ڈوور پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے بس اب سمندری چہاز میں داخل ہو گی اور بعد میں یہ سمندری چہاز میں بس سمیت فرانس کی بندرگاہ بولون تک لیجائے گا۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم کشم وغیرہ کی رسمات طے کر لیں۔ آدمی رات کا وقت تھا۔ ڈوور کی بندرگاہ کو تو خیر ہم کیا دیکھتے تھے لیکن اس کے اطراف چھیلی ہوئی سفید رنگ کی

پہاڑیوں کو دیکھ کر ہمارے وجود میں اجالا سا پھیل گیا۔ سجان اللہ کیا اجمل اور شفاف پہاڑیاں ہیں۔ یوں لگا جیسے کسی نے سارے ماحول میں روئی کے گالے اچھال دینے ہوں۔ اس منظر کو دیکھ کر ہماری روشنی طبع کچھ اور تیز ہو گئی۔ اور ہمیں ہر طرف پسیدی کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ باول نخواستہ اس منظر کو چھوڑ کر ہم دوبارہ بس میں سوار ہو کر سمندری جہاز میں داخل ہونے لگے تو دیکھا کہ بسوں کی ایک لمبی قطار ہے جو سمندری جہاز میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جہاز کی پٹھی منزل میں بس رکی تو ہمیں بتایا گیا کہ ہم فرانس کی بندرگاہ بولون کے آنے تک آزاد ہیں۔ جہاز میں چہاں چاہیں بیٹھیں مگر بولون کے آتے ہی بس میں آن بیٹھیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوتی۔ فرانس اور انگلستان کے بیچ سمندر میں اکثر تنوں رہتا ہے۔ ہم جہاز کے ریستوران میں بیٹھے سمندر کے اشتعال کو کافی لپی لپی کرتا ہو میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک امریکی لڑکی جو بس میں ہماری ہمسفر تھی ہمارے پاس آئی اور ہم سے سگریٹ مانگنے لگی۔ ہم نے اس کی خدمت میں سگریٹ پیش کیا تو ہماری قومیت، ہماری تعلیم، ہمارے پیشے وغیرہ کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرنے لگی۔ اس کی معلومات میں خاصہ اضافہ کرنے کے بعد ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا تو اعلان ہوا کہ بولون کی بندرگاہ آگئی ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار ہمیں رو دبار انگلستان کے مختصر ہونے کا دکھ ہوا۔ وہ بولی کوئی بات نہیں، بس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں آپ کی معلومات میں اضافہ کروں گی۔ ہم پھر کشم رسمات سے گذر کر بس میں آن بیٹھے۔ امریکی لڑکی نے پھر ہم سے سگریٹ مانگا اور گلی ہماری معلومات میں اضافہ کرنے۔ پہتہ چلا یورپ کی سیر کو لگی ہے۔ ماں باپ کی اکتوبری بیٹی ہے۔ اللہ نے سب کچھ دیا (سگریٹ کے سوائے)۔ ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اس لئے کہ ابھی دنیا نہیں دیکھی۔ یوں بھی دنیا کو دیکھنے بغیر شادی کرنے کا کیا فائدہ۔ ہماری طرح نہیں کہ شادی ہوئے پھر پس برس بیت گئے ہیں اور اب دنیا دیکھنے کو لگے ہیں اور وہ بھی بیوی کے بغیر۔ یوں بھی مخدومی مشتاق احمد یوسفی نے کہیں لکھا ہے کہ پیرس کی سیر پر جاتے ہوئے اپنے ساتھ بیوی کو لاد کے لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی ہمالیہ پہاڑ پر جانے لگے اور اپنے ساتھ احتیاطاً تھرماں میں برف کی ایک ڈلی بھی رکھ لے۔ خیر پیرس کی

سر زمین پر ہماری بس نے قدم رنج فرمایا تو صبح کی اوپنیں ساعتیں آچکی تھیں۔ فرانسیسی دیہاتوں کے اجڑے، سفید اور چکیلے مکانوں نے ہماری آنکھوں کو منور کر دیا۔ برطانوی مکان زیادہ تر سرخ اپنیوں کے بنے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ بھورایا زردی مائل سا ہوتا ہے جبکہ فرانسیسی مکان سفید اور بھر کیلئے ہوتے ہیں۔ فرانس کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں اس بات سے سخت تشویش ہوئی کہ ہماری بس نے اچانک ٹریک کے قواہد کی خلاف ورزی شروع کر دی یعنی جو بس اب تک سڑک کے باہمیں طرف چل رہی تھی اس نے اچانک دائیں طرف کو چلا شروع کر دیا۔ سارا یورپ دائیں طرف کو چلتا ہے مگر برطانیہ اپنے رواہی مزاج کی وجہ سے باہمیں طرف کو چلتا ہے۔ پکھہ دریہ کے عجیب سی الجھن ہوتی رہی۔ پھر اپنی یقینوں پر غصہ بھی آیا کہ چار دن کے لئے فرانس میں آئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرانسیسیوں کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔

بس جوں بیرونی کے مقابلات سے گذرنے لگی ہمیں مسرو خورشید کا خیال آنے لگا۔ ان سے پچھلی شام فون پر یہ بات طئے ہو گئی تھی کہ وہ بیرونی کے محلہ اشامن گراڈ کے بس اسٹاپ پر ہمارا انتظار کریں گے۔ پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ جب روس میں اشامن گراڈ باتی نہیں رہا تو بیرونی میں کہاں سے آئے گا مگر لوگوں نے یقین دلا یا کہ بیرونی میں دوسری جنگ عظیم کی یادگار کے طور پر ایک محدود اشامن گراڈ موجود ہے۔ اشامن گراڈ کا مسئلہ تو خیر حل ہو گیا تھا لیکن مسرو خورشید کا مسئلہ ہم سے طئے نہ ہوتا تھا کیونکہ مسرو خورشید سے ہماری کبھی ملاقاتات نہیں ہوئی تھی۔ دوستوں سے ان کا ذکر بہت سا تھا۔ ان کی قلندری اور ان کے مزاج کے مد و جزر کی داستانیں بھی سنی تھیں۔ لندن میں کئی برس گزارنے کے بعد پچھلے سات آنھوں سوں سے وہ بیرونی میں مقیم ہیں اور تھارہ ہتھی ہیں۔ ہر شریف آدمی کی طرح ماضی بعید میں ان کا تعلق حیدر آباد سے رہ چکا ہے اور علامہ رشید رائی مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔ ہم نے مسرو خورشید کو اشامن گراڈ کے بس اڈے پر پہنچانے کی خاطر اپنے ایک دوست سے مسرو خورشید کے جیلیہ کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا پاکستان کے سابق صدر جنگل یحییٰ خاں کے ہم شکل ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنے شخصی حافظہ میں

جزل سچی خان کے نقوش کو از سرفوتا زہ کرنے کی کوشش کی تو بد صیر کی تاریخ نے ان کا جو چہرہ بنا لیا
تھا اس کے خدو خال ذہن میں ابھر نے لگے۔ بارے اشان گراڈ کے بس اڑے پر اتر کر اب جو
ہم نے جزل سچی خان کو تلاش کرنا شروع کیا تو جزل صاحب تو کہیں نظر نہ آئے البتہ ہندوستانی
فلموں کے مزاجیہ اداکار دھول کے ہم شبل ایک صاحب دور سے تیز تیز آتے ہوئے دکھائی
دیئے۔ یہ مسروخور شید تھے۔ پر تقد، پھر تیلے اور گٹھیلے بدن کے۔ پیرس کی اس سرداور کی پکپاتی صبح
میں وہ پکھا لیکی گرم جوشی سے ملے کر ہماری ساری تھکن دو رہ گئی۔

ہماری ان سے یہ بھلی ملاقات تھی۔ سو ہم عادتاً ان سے کچھ رسمی گفتگو بھی کرنا چاہتے تھے تھے مگر وہ
ہماری رسمی گفتگو کو سنتے کے مشاق نظر نہیں آئے۔ انہوں نے فون پر ہم سے کہہ دیا تھا کہ ہم اپنے
ساتھ اپنا ایک عدد فون ٹوبھی لے آئیں۔ انہوں نے پوچھا ”آپ کافنوٹو کہاں ہے؟“ ہم نے فونوں ان
کے ہاتھ میں تھامایا تو اسے لے کر تیز تیز قدموں سے زیر زمین اترنے لگے۔ یہ اشان گراڈ کا
زمین دوزریلوے اسٹیشن تھا۔ پیرس کی زمین دوزریل کو ”میٹر“، ”کہا جاتا ہے۔ لندن کی ”نیوب“
اور پیرس کی ”میٹر“ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فرانس کی ریلیں یوروب کی ریلیوں میں سب
سے کارکرو اور کامیاب تھیں۔ رفتار جتنی تیز کرایہ اتنا ہی کم ہے۔ مسروخور شید نے دو چار
منٹ میں میٹر دیں۔ ہمارے ایک ہفتہ کے سفر کا پاس بنوا دیا۔ ہمیں لے کر چھپا کے ایک ڈین
میں گھس گئے۔ پھر بولے ”حضرت! آپ سے مشکل یہ ہے کہ آپ نے پیرس کی سیر کے لئے
صرف چار دن نکالے ہیں۔ چار دن بہت چھوٹے ہیں اور پیرس لندن سے چھوٹا شہر ہونے کے
باوجود لندن سے بہت بڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کم سے کم دلت میں نیادہ پیرس دیکھیں۔ میں
نے چار دن کی چھٹی لے لی ہے اور پورے سایک ہفتہ کا کھانا بنوایا ہے۔ اب نورا گھر چلتے ہیں۔ سامان
رکھ کر فوراً بھاگتے ہیں۔“

انہوں نے ہمیں جواب میں بولنے کا موقع نہیں دیا کیونکہ اتنی دیر میں وہ اسٹیشن آگیا جہاں
مسروخور شید کا گھر تھا۔ ان کا گھر جس علاطے میں ہے اسے RUE MUFFTARD کہتے ہیں۔

بولنے میں اس کا تلفظ ”روم افاؤ“ اوہ ہوا ہے۔ ہم نے تازلیا کر کوئی افتاد پڑنے والی ہے۔ پتہ چلا اس علاقہ میں زنان کے کئی نامور مصور اور ادبیب رہ چکے ہیں۔

ان کا گھر ایک کرہ پر مشتمل ہے جو دنیا بھر کی کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ (اردو کی کتابیں زیادہ ہیں)۔ مسرو خورشید کے بارے میں وقار لطیف کا جملہ یاد آیا کہ کتابیں مسرو خورشید کا اوڑھنا بچھوٹا ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ اس کرے میں کتابوں کے سما جانے کے بعد خود مسرو خورشید کے رسہنے کے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار متواتر چار دنوں تک ہمیں بھی کتابوں سے نہ صرف تربیت بلکہ خود کتابوں کے اوپر رسہنے کا موقع ملا کیونکہ ہمارے لئے جو پنگ انہوں نے مختص کر رکھا تھا اس کے نیچے پنگ کی سطح تک کتابیں باللب بھری ہوئی تھیں بلکہ بعض معرب کتابیں تو سطح سے اوپر تک جھانکنے لگی تھیں۔ چنانچہ پہلی رات ہمیں پنگ پر چین کی فیز نہیں آئی تو انہوں نے دوسرے دن از راہ عنایت ہمارے پنگ کے نیچے سے دانتے نظرے، کوئی نہیں، بہردار ڈشاہ اور سارہ تر کی کتابیں نکال کر فیض احمد فیض اور احمد ندیم تاسی کے شعری مجموعے اور کرشن چندر اور ترۃ الحین حیدر کے انسانوں کے مجموعے رکھ دینے تھے۔ دوسری رات ہمیں سچ چھپری اور پسکون فیز آئی۔ اردو سے ہمیں کتنی محبت ہے اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

مسرو خورشید عجلت اور جلد بازی کا نمونہ ہیں۔ ہر دم بے چین، مستعد اور پھر تسلی۔ گھر پہنچ کر وہ کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئے۔ ہم نے موقع کو غیمت جان کر کر سیدھی کرنی چاہی تو کیا دیکھتے ہیں کہ مسرو خورشید اپنے دنوں ہاتھوں میں دلبی لمبی چھڑیاں لئے چاہ رہے ہیں۔

ہم نے کہا ”یہ آپ نے اچھا کیا کہ پیرس کی سیر کے لئے دو واگنگ اسکس Walking Sticks خرید لیں۔ ایک آپ کے کام آئے گی اور ایک کو میں استعمال کروں گا۔“

بولے ”آپ کو غلط فتحی ہوئی ہے۔ یہ چھڑیاں نہیں روٹیاں ہیں۔“

ہم نے حیرت سے ان قد آدم روٹیوں کو دیکھا۔ فسوں کے نظیر اکبر آبادی کی نظر ان روٹیوں پر نہیں پڑی ورنہ انہیں چاند اور سورج روٹیوں کی طرح دکھائی نہیں دیتے بلکہ مینار پر روٹی کا گمان

ہونا۔ ہمارے ملک میں ایسی روٹیوں کا رواج بہت کار آمد ہو سکتا ہے۔ بالخصوص خندی بچوں کو روٹی کھانا آسان ہو جائے گا۔ شرافت سے روٹی کھانے کی تو نجیک ہے ورنہ اسی روٹی سے خندی بچوں کی پٹائی شروع کر دی۔ مسرور خورشید نے ہمیں پنگ پر آرام کرتے دیکھا تو بولے "حضرت! یہ آپ اپنی کمر و غیرہ لندن جا کر سیدھی سمجھئے۔ پرس میں آپ کو لگانا رکھو منا ہے۔ پانچ منٹ میں کھانا کھا کر چلتے ہیں۔ پہلے ہم لووف کے شہرہ آفاق میوزیم کی سیر کریں گے سہ پہر بغل ٹاؤن کے سامنے میں گذرے گی۔ شاہراہ شاہزادیز سے شام میں آپ کا انتظار کرے گی۔ محراب فتح کے دیوار بھی وہیں ہو جائیں گے۔ اور دریائے سین تو آپ کوئی جگہ مل جائے گا۔ ویسے آپ کی ساری شامیں بک ہو چکی ہیں۔ میں نے پرس کی بعض اہم خصیتوں سے کہہ رکھا ہے کہ آپ آرہے ہیں۔ یہ خصیتوں آپ سے ملنے کے لئے میرے گھر آئیں گی۔ آج کی شام سوبورن پونشوسرنی کے صدر شعبہ اردو جناب عبدالماجد آپ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔ ہمیں سات بجے گھر پہنچنا ہوگا۔ کل دن میں پرس کی مشہور کتب فروش کمپنی "ہیکسپر اینڈ کمپنی" کے مالک اور واثور مسر جارج سے ملنا ہے۔ شام میں عالمی شہرت یافتہ مصور حیدر رضا آپ سے ملنے آرہے ہیں۔ پرسوں ایک فرانسیسی واثور کرستیان لا دوا اور ڈاکٹر جمید اللہ صاحب کے پاس آپ کو چلنا ہے۔"

ہم نے کہا "خاں صاحب! مسر جارج اور کرستیان لا دوا کے بارے میں تو ہم نہیں جانتے۔ البتہ حیدر رضا اور ڈاکٹر جمید اللہ کے بارے میں خوب جانتے ہیں۔ ہم اس تفاصیل نہیں ہیں کہ انہی خصیتوں سے ملیں۔ حیدر رضا ایک بار دلی آئے تھے۔ دلی کے رابندر بھوون میں انہیں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت ہماری ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ان سے ملیں۔ جس فکار سے ہم دلی میں نہیں ملے اس سے اب پرس میں ملاقات کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر آپ نے اتنے بڑے فکار کو لپنے ہاں کیوں بلایا۔ اخلاق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم خود جا کر ان سے ملیں۔"

مسرور خورشید بولے "حضرت! یہ سب کار گیری ہے۔ میں نے حیدر رضا کو بتایا ہے کہ آپ اردو کے پائے کے اویب ہیں۔ اس پر حیدر رضا نے کہا کہ وہ خود آپ سے ملنے کے لئے آئیں

گے۔ چنانچہ کل شام وہ آرہے ہیں۔“

ہم نے کہا ”مگر میں بھی مجھ اس قابل نہیں ہوں کہ جید رضا جیسے بڑے آرٹ سے ملوں۔“

بولے ”مگر میں نے تو آپ کو اس قابل بنادیا ہے۔ چلئے اب اس منکے پر بات نہیں ہوگی۔ اب انھے بہت دیر ہو رہی ہے۔“ یہ کہہ کر سر در خور شیدہ میں تقریباً گھستنے ہوئے گھر کے باہر لے گئے۔ سر در خور شیدہ نے پیرس کی سیر اس طرح کر لی جیسے قصائی بکرے کو ذبح کرنے کے لئے لے جاتا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم لووف Louvre کے شہرہ آفاق میوزیم میں تھے۔ لووف کا میوزیم جس محل میں واقع ہے وہ چالیس ایکٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اتنا بڑا میوزیم ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے ایک عمر چاہئے۔ یونان، روم، مصر اور مشرقی ممالک کے شجے الگ ہیں۔ دنیا بھر کے جسمے اور مصوری کے شاہکار ہیں۔ جتنے قیمتی جسمے اور پینٹنگس اس میوزیم میں ہیں دنیا کے کسی اور میوزیم میں نہیں ہیں۔ دوسری صدی قبل مسیح کے مشہور و معروف ونس ڈی میلو کے جسمے کا دیدار بھی نہیں ہوا۔ یونارڈ ڈ اوپنجی کی شہرہ آفاق پینٹنگ ”مونالیزا“ کو بھی اسی میوزیم میں دیکھا۔ اس تصویر کی یوں حفاظت کی جاتی ہے جیسے کوئی زندہ ہستی ہو۔ بلکہ پروف شیشے کے چھپے سے مونالیزا ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور ہم اس بات پر مسکراتے رہے کہ بلکہ پروف شیشے کی حفاظت میں رہنے کے باوجود ایک سپاہی بندوق تانے مونالیزا کی مسکراہٹ کی حفاظت کر رہا ہے۔ فرانسیسیوں کی انگریزی دیا تو یونیکی کمزور ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر اپنی انگریزی کو کمزور بناتے چلتے ہیں۔ اس میوزیم میں ہمیں ایک جگہ انگریزی عبارت نظر آئی جس میں لکھا تھا CLOACK ROOM FURTHER DOWN NOT HERE۔ اس انگریزی عبارت کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ اس منزل سے بچے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اور اگر آپ کو پیشاب وغیرہ آرہا ہے تو ہمیں سے فارغ ہو کر جائیں کیونکہ بچے کوئی پیشاب خانہ وغیرہ نہیں ہے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کسی فرانسیسی کو انگریزی آتی بھی ہو تو وہ انگریزی نہیں بولتا اور اگر بولتا ہے تو انگریزی کا کچھ مرنکاں دیتا ہے۔ فرانسیسیوں کے قول فعل کا بھی کوئی بھروسہ نہیں کیونکہ یہ لکھتے کچھ

ہیں اور پڑھتے کچھ اور ہیں۔ "PALAIS DE CHAILLOT" کو پہلے دی شیو بولتے ہیں۔ مشہور شاہراہ ELEYSEES- CHAPMS- MONT MARTRÉ کے مشہور گر جا گھر کو موارت بولتے ہیں۔ VERSAILLES ان کے پاس صرف درسائیں جاتا ہے سایی لئے ہم فرانسیسی نام پڑھ لیتے تھے لیکن ان کا نام اپنی زبان پر نلاتے تھے۔ خیر لوف کے میوزیم سے ہم حیرت زدہ ہو کر نکلنے تو بغل نا ور جا پہنچے۔ ۲۴۰ میٹر اونچا نولا دی نا ور ۱۸۸۹ء میں بناتا۔ اس کے اوپر چڑھ جائیتے تو نہ صرف سارے پیرس دکھائی دیتا ہے بلکہ پیرس کے بہت سے نواحی علاجتے بھی دیتے ہیں۔ یہ پیرس میں ہر جگہ سے دکھائی دیتا ہے۔ ایک انگریز ادیب نے بغل نا ور کے بارے میں لکھا تھا کہ پیرس میں اس بد نما ذھانچے کے دیبا ارے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود بھل نا ور پر جا کر بیندھ جائے۔ بھل نا ور کے سامنے دریائے سین بہت سیلیقے سے بہتا ہے۔ دریا کے پل کو عبور کر کے آگے نکل جائیے تو پہلے دی شیو آتا ہے۔ یہاں پیشہ تھیز ہے اور کئی قسم کے میوزیم ہیں۔ پر عمارتیں ۱۹۳۷ء میں بنی تھیں۔ یہ پیرس کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے۔ بالخصوص رات میں تو اس کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم بہت دیر تک دریائے سین کے کنارے کھڑے رہے۔ یوروپ کے اکثر دریا ہمیں نہایت شریف اور مہذب نظر آئے۔ سین میں اس وقت کئی جہاز چل رہے تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ یوں بھی سو بورن یونیورسٹی کے پروفیسر عبد الماجد آنٹھ بیجے گھر آنے والے تھے۔ وہ تھیک وقت پر آئے۔ سوچا تھا کہ ان سے ادب پڑھنے اور غیرہ پر بات ہو گی مگر وہ مسرو خور شید کے بنائے ہوئے حیدر آبادی کھانوں کے ذائقے میں کچھ اس طرح کھو گئے کہ ادب کا نمبر ہی نہیں آیا۔ پروفیسر عبد الماجد خود بھی حیدر آبادی ہیں۔ غالباً آزادی سے پہلے پیرس چلے گئے تھے۔ حیدر آباد کا حال پوچھا۔ ہم نے فرانسیسی ادب کا حال پوچھنا چاہا تو وہ حیدر آبادی کھانوں کا ذکر لے جیٹھے۔ ہم نے بھی علم و ادب کو دور رکھا اور حیدر آبادی کھانوں میں کھو گئے۔ ہم فرانس کے بارے میں کوئی سوال کرتے تو وہ جواب میں حیدر آباد کی کسی چیز کے بارے میں سوال کرنے لگتے تھے۔

حیدر آباد کا جوڑ کر کیا

صاحبہ میں حیدر آباد کو جوڑے ہوئی تیرہ برس بیت گئے۔ اب ہم زندگی میں خوکریں کھانے کے لئے حیدر آباد کی نیں بلکہ دلی کی سڑکوں کو زحمت دیتے ہیں۔ پھر بھی سال میں دو تین موقعے ایسے ضرور آ جاتے ہیں جب ہم حیدر آباد کی سڑکوں پر پھر سے خوکریں کھانے کے لئے آ جاتے ہیں کیونکہ خوکریں کھانے کے لئے اس سے بہتر سڑکیں کسی اور شہر میں دستیاب نہیں ہیں۔ انتہا برسوں میں حیدر آباد میں کیا تبدیلی آئی اور کیا نہیں آئی یہ ہم نہیں جانتے۔ بہن اتنا جانتے ہیں کہ تیرہ برس پہلے ہمارے گھر کے سامنے میں ہول کا جوڑہ حکمی غائب تھا وہ ہنوز غائب ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک پلک نل بھی قابلہ اب بھی ہے۔ تیرہ برس پہلے عوام کو اس نل کی ٹوٹی کو بار بار کھو لئے میں دشواری پیش آئی تھی لہذا کسی نے عوام کی سہولت کی خاطر اس کی ٹوٹی غائب کر دی تھی۔ یہ بھی تک غائب ہے۔

ہمارے گھر کے سامنے میں برس پہلے ایک دیوار پر منج� بنانے والی ایک کمپنی نے اپنے منجن کا اشتہار جلی حروف میں لکھوایا تھا۔ ہم یہ منجن تو استعمال نہیں کرتے تھے مگر اجنیوں کو لپنے گھر کا پتہ سمجھانے کے لئے اس اشتہار کو ضرور استعمال کرتے تھے۔ یہ اشتہار اب بھی وہیں موجود ہے۔ اگر چہ منجن بنانے والی کمپنی کب کی مرچکی ہے مگر ہمارا پتہ ابھی تک زندہ ہے۔ اس منجن کو استعمال کرنے والے بھی شاید اب اس دنیا میں زندہ نہیں ہیں۔ اگر یہ مرے نہیں ہیں تو ان کے دانت ضرور گر گئے ہوں گے کیونکہ منجن کی خاصیت بلکہ خوبی عی الیک تھی۔

یوں تو کہنے کو حیدر آباد جوں کا توں موجود و محفوظ ہے لیکن اس کے باوجود اور چند برسوں سے جب بھی ہم حیدر آباد آتے ہیں تو حضرت جگر مراد آبادی کی طرح ہمیں بھی یہاں کی ہر شے میں کسی

شے کی کمی نظر آتی ہے۔ حیدر آباد وہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب حیدر آباد میں ہمیں خود حیدر آباد کی کمی نظر آتی ہے۔ تیرہ برس پہلے شام کو معظم جانی مارکیٹ پر نکلتے تھے تو ہر چند قدم کے بعد کوئی نہ کوئی ملنے والا پیچھے سے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا کہ ”بھیجا! کہاں چے، کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟“ اب معظم جانی مارکیٹ پر نکلتے ہیں تو اس کی سڑک تو وہی ہے مگر وہ ہاتھ جو پیچھے سے ہمارے کندھے پکڑ لیتا تھا انہیں غائب ہو گیا ہے۔ بہت ہوا تو اتنا ہوتا ہے کہ کوئی رکشا والا اچانک ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دے دیتا ہے کہ ”ابے سڑک پر کھڑا چلتا ہے۔ ف پا تھوڑا پول۔“ فٹ پا تھوڑا پر جاتے ہیں تو کوئی بزرگ ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں ”ارے میاں! کیا اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھتے نہیں فٹ پا تھوڑا پر دارخواشن بن چکی ہیں۔ سڑک پر جاؤ۔“ ادھر کئی برسوں سے ہم حیدر آباد میں اس محبت بھرے ہاتھ کی ٹلاش میں ہیں جس کی اچانک گرمی ہمیں اس شہر سے جوڑ دیتی تھی۔

ہمیں یاد ہے کہ پہلے سال مارچ میں لندن کی ایک سرد شام کو آسپورڈ اسٹریٹ سے گذر رہے تھے کہ ہو بھوایا ہی ایک زمگرم ہاتھ ہمارے کندھے پر رکھا گیا۔ پیچھے ملے بغیر ایک لمحہ کے لئے سوچتے رہے کہ ایک اجنبی شہر میں یہ کیسا اجنبی ہاتھ ہے جس کا مس جانا پچانا سالگتا ہے۔ ہم نے پیچھے سڑک رکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری نوجوانی کا دوست مجید لپنے بالوں میں چاندی سجائے کھڑا ہے۔ اس نے ہم سے بے ساخت بغل گیر ہوتے ہوئے کہا ”ارے تم! تم آسپورڈ اسٹریٹ پر کیسے آگئے؟“

ہم نے کہا ”یا را میں لندن کی آسپورڈ اسٹریٹ پر کہاں ہوں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میں کئی برسوں بعد حیدر آباد کی عابر روڈ پر کھڑا ہوں۔ میں تو تمہیں عابر روڈ پر ڈھونڈتا رہا اور تم لندن میں کیا کر رہے ہو؟“

مجید بولا ”یا را میں برس سے لندن میں ہوں اور تم مجھے ابھی تک عابر روڈ پر ڈھونڈتے ہو۔ عجیب حق ہو۔ اچھا یہ بتاؤ لندن میں کہاں ٹھہرے ہو۔ اپنا پتہ دو۔ ایک دن میرے گھر چلو۔

خالص حیدر آبادی کھانا کھلاؤں گا۔“

ہم نے کہا ”یاراللندن آئے ہوئے نہیں دن ہو گئے۔ ان نہیں دنوں میں اتنے حیدر آبادی کھانے کھائے ہیں کہ خود حیدر آباد میں بھی پچھلیتیر ہر سوں میں نہ کھائے ہوں گے۔ کھانا ہی ہوتا انگریزی کھانا کھلاؤ۔ میں تو انگریزی کھانا کھانے کے لئے ترس گیا ہوں۔“

مجید بولا ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دو حیدر آبادی پرنس میں ملیں اور بھارے بیٹھنے پنج میں نہ آئیں۔“



پنج پوچھئے تو پچھلے برس پوروپ، امریکہ اور کینڈا کے دورہ کے بعد ہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ جس حیدر آباد کو ہم حیدر آباد کی مرکزوں پر تلاش کرتے پھرتے ہیں وہ تولندن کی مرکزوں پر ملتا ہے۔ پھر اس کی گلیوں میں پایا جاتا ہے۔ شکا کو کے پچھلے کوڑہ میں ملتا ہے۔ ٹور ہنو کے بنجارة ہلز میں پایا جاتا ہے۔

ہمیں اس وقت پچھلے سال ۲۰ اکتوبر کی وہ شام یاد آ رہی ہے جب جنوبی لندن کے ایک ہال میں ہمارے دوست عبیب حیدر آبادی کی بیٹی کی شادی مقرر تھی۔ ہم تقریب عقد میں پہنچ تو یوں لگا جیسے ہم کئی برس بعد حیدر آباد والپس آئے ہیں۔ وہ سارے حیدر آبادی جنہیں ہم حیدر آباد میں ڈھونڈتے پھرتے تھے یا وہ سارے حیدر آبادی جو حیدر آباد میں ہم سے منہ چھپاتے تھے وہ سب کے سب وہاں موجود تھے۔ حیدر آبادی شیر و انبوں میں ملبوں حیدر آبادیوں کو دوبارہ زندہ و سلامت پا کر ہمیں کتنی خوشی ہوتی، اس کا حال ہم کیا بیان کریں۔

حیدر آبادی کھانوں اور شاماتہ العصر کی ملی جلی خوشبوؤں میں بے بے حیدر آباد کی بازیافت ہمارے لئے ایک انوکھا تجربہ تھی۔ ہمارے ایک حیدر آبادی دوست جن کی مغفرت کے لئے ہم پچھلے کئی برسوں سے دعا کرتے آ رہے ہیں وہ ہمیں وہاں نہ صرف زندہ سلامت ملے بلکہ اپنی تیسری انگریزیوی کا تعارف بھی ہم سے کرو یا معلوم ہوا کہ پچھلی دو انگریزیویوں میں سے ایک تولند کو پیاری ہو گئی اور دوسری کسی اور کو پیاری ہو گئی۔ عبیب حیدر آبادی کی بیٹی کی شادی کی جس

تقریب کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں انگریز تھا اور ایک حیدر آبادی لڑکے شادی کرنے کی کوشش میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کے اصلی انگریزی نام کے ساتھ اس کے نئے اسلامی نام کو جو زن سے اس کا نیا نام ”الفریڈ عرفان“ بن گیا تھا۔ چنانچہ شادی کے کارڈ میں وہاں کا نام نور چشم الفریڈ عرفان لکھا گیا تھا۔ شادی اسلامی طریقہ سے ہوتی تو کوئی بات بھی تھی مگر یہاں شادی حیدر آبادی رسومات کے مطابق ہو رہی تھی۔ لہن کے ماں اور ہمارے دوست ڈاکٹر مفتی قبسم نور چشم الفریڈ عرفان کی شادی کا سہرا حیدر آباد سے بطور خاص بنوا کر لے آئے تھے۔ سہرے کو صحیح و سالم حالت میں لندن لانے کی جگہ تو مفتی قبسم کا سوت کیس سیرین انڈلانس کے طیارے میں ہی رہ گیا تھا اور وہ جب سے لندن آئے تھے ایک ہی سوت پہن کر شادی کی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اس حیدر آبادی سہرے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں سے وہاں کا چہرہ و کھائی نہیں دیتا تھا۔ ہمارے حیدر آبادی دوپیے بھی بھی سہرے کو اپنے چہرے سے ہٹا کر پاراپیوں کو دیکھ بھی لیتے ہیں مگر نور چشم الفریڈ عرفان نے حیدر آبادی رسومات کا اتنا پاس و لحاظ رکھا کہ کسی محرم کی نظر اپنے چہرے پر پڑنے نہیں دی۔ دوپیے کے انگریز رشتہ داروں اور احباب کی سہولت کی خاطر حیدر آبادی رسومات کی نزاکتوں کے بارے میں سلیمان انگریزی زبان میں ایک تقریب بھی کی گئی۔ انگریزوں کو بتایا گیا کہ عقد کے بعد جب چھوپا رے اچھا لے جائیں تو انہیں لوا جائے۔ انگریزوں کی نوا آبادیات جب سے ختم ہوئی ہیں وہ لوٹ مار کے عادی نہیں رہے۔ مگر چھوپا روں کی لوٹ مار میں ان کی نظری صلاحیت کام کر گئیں۔ ہم نے دو بادام، ایک کھجور اور مصری کی ایک ڈلی لوٹی تھی۔ ہم لوٹ کا یہ مال ہاتھ میں لئے بیٹھے تھے کہ ایک انگریز نے اچانک ہمارے ہاتھ کو زرد دستی مردود کر یہ مال غنیمت حاصل کیا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ عقد کے بعد ہمارے دوست حبیب حیدر آبادی کی طرف سے عشا نیہ کا انتظام تھا۔ عشا نیہ کیا تھا حیدر آبادی کھانوں کی نمائش تھی۔ تین اقسام کی بے یاری تھی۔ قمیاں، دھی کی چنی، کباب، بگھارے بیٹنگن، دم کا مرغ، ڈبل کا یٹھا، خوبانیوں کا یٹھا، سویاں سب کچھ تھا۔ اس عشا نیہ کی خوبی یہ تھی یہ بلا لحاظ مذہب و ملت سب کے لئے تھا۔ وہاں کے انگریز رشتہ داروں کی خدمت میں بھی یہی حیدر آبادی

کھانا پیش کیا گیا۔ لہذا ہم نے دیکھا کہ ایک انگریز وہی کی جتنی میں ذہل کا بیٹھا ملا کرنے صرف کھا رہا تھا بلکہ حیدر آبادی پکوان کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ ایک انگریز کتاب میں بھارے ٹینکن ملا کر کھارہا تھا۔ ایک اور انگریز مرغ کی نامگ کی مدد سے خوبیوں کا بیٹھا کھارہا تھا۔ انگریز جس طرح حیدر آبادی تہذیب کو کھارے ہے تھے، اسے دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھرا آرہا تھا۔ ہمارے دوست مفتی غیسم نے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد مہماںوں کے لئے حیدر آبادی پان بھی بنار کئے تھے۔ یہ پان کھانے کے بعد مہماںوں کو پیش کئے گئے۔ انگریزوں کو آسان انگریزی میں بتایا گیا کہ اگر پان کھانے کے بعد منہ سے لال رنگ کا تھوک نکلے تو اس سے پریشان ہو کر ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریز تھوک کرنے کو بہت برائحتی ہیں لیکن اس دن بہت سے انگریزوں کو پان کھانے کے بعد پہلی بار پتہ چلا کہ تھوک کا کس کو کہتے ہیں اور تھوک کرنے کے حیدر آبادی آداب کیا ہیں۔ ایک انگریز دیر سے محفل میں آیا۔ اس نے لوگوں کو پان کھاتے دیکھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ ہم نے سوچا یہ انگریز تو پان کا بہت شو قیں معلوم ہوتا ہے مگر جب اس نے آستین چڑھا کر پان پر پان کھانا شروع کیا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”بھیتا! کھانا وانا کھایا یا نہیں؟“ بہت حیرت کے ساتھ ہم سے پوچھنے لگا ”کیا اس کھانے کے علاوہ اور بھی کچھ کھانے کا انتظام ہے؟“

غرض لندن میں قیام کے دوران میں ہم نے حیدر آبادی تہذیب کو جس طرح پران چڑھتے دیکھا اس سے ہمارا اول با غبارہ ہو گیا۔

ہمارے دوست عامر موسوی اور عباس زیدی کے ہاں حیدر آبادی نہاری اور بکرے کی جتنی زبانیں کھائیں اتنی کبھی اور کہیں نہیں کھائیں۔ عامر موسوی نے ہمیں بتایا کہ حیدر آبادیوں کے لندن آنے سے پہلے انگریز اپنی زبان کی اہمیت سے تو واقف تھے لیکن بکرے کی زبان کی عزت کا ہم حیدر آبادیوں سے ہی سیکھا۔ پہلے انگریز قصائی بکرے کی زبان کو پھینک دیتا تھا مگر اب حیدر آبادیوں کے انتظار میں یہیت کے ریفریجریٹر میں رکھتا ہے۔ اگر کوئی حیدر آبادی نہیں آتا تو خود کھالیتا ہے۔ ماں کے انگریزوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا مگر تم اس بات کو کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ حیدر آبادیوں نے انہیں بکرے کی زبان کھانے کا گر سکھایا۔ حیدر آبادیوں کے آنے

سے پہلے انگریز دنیا کی ایک بڑی لذت سے خردم تھے۔ وحی تو یہ ہے کہ اب بعض انگریز بھی صبح کو کچھ مزی، خالی گینہ، آچار اور اٹلی کی چنپی، پاپڑ وغیرہ کھانے لگے ہیں۔ لندن میں ہمارا قیام، قیام مددین کے ہاں تھا اور وہ لندن میں مقیم ہی اس لئے تھے کہ یہاں رہ کر خالص اشیاء کی مدد سے لذیذ چیز رآبادی کھانے بنائے جاسکتے ہیں۔

ہم نے اپنے اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”خدا کے لئے اب حیدر آبادی کھانوں کا ذکر نہ کیجئے۔ مجھے اب کافی آرہی ہے۔ کیا حیدر آبادی تہذیب اب صرف پکوان میں ہی انگ کر رہ گئی ہے۔“

بولے ”یہ بات ہے تو لوگوں سے مخدوم کے شعر سنو۔ احمد حیدر آبادی کی رباعیات اور شاوا تملکت کے شعر سنو۔ میں تو ضرورت پڑنے پر کنوں پر شاد کنوں کے بھی شعر نہ سکتا ہوں۔“

سر و خور شید کا گھر حیدر آبادی اور بیوں اور شاعروں کی کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ گھر میں اتنی کتابیں ہیں کہ ان کا پلٹنگ بڑی مشکل سے گھر میں سماپنا ہے۔ بیرس میں ہماری آمد کے پیش نظر اپنا پلٹنگ انہوں نے ہمارے لئے خالی کر دیا تھا اور خود حیدر آبادی اور بیوں اور شاعروں کی کتابوں پر سو جاتے تھے۔ رباعیات امجد کھرہانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ فرنگ آصفیہ کو اسنول کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کھڑکی کو اچھی طرح بند کرنے کے لئے کلیات قلب شاہ سے استفادہ کرتے تھے۔ حیدر آبادی تہذیب ان کے لئے صرف کھانا ہی نہیں بلکہ اوڑھنا بچھونا بھی تھی۔ بیرس میں پہلے ہی دن بیرس کی سیر کروانے کے لئے ہمیں زمین دوزڑیں "سیڑہ" سے لے کر چلے تو بولے "ذرالاس اشیش کا نام پڑھیجئے۔" ہم نے رومیں رسم الخط میں فرانسیسی نام کو پڑھنے

کی کوشش کی توپتہ چاڑا اشیش کا نام ”مواسیر“ ہے۔ ہم نے کہا ”یہ اشیش ہے یا بیماری۔ پیرس کی سیر کا آغاز ہی ہم غلط اشیش سے کر رہے ہیں۔“ بولے ”کوئی فکر کی بات نہیں بھل نادر سے تربیب آپ جس اگلے اشیش پر اتریں گے اُس سے آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔“ بھل نادر سے تربیب اشیش پر اترنے تو مسرور خورشید نے کہا ”اب اس اشیش کا نام پڑھیے۔“ ہم نے نام پڑھا تو تلفظ اس طرح ادا ہوا، ”بہرے حکیم۔“ بہنس کر بولے ”جب ہم مواسیر سے اپنے حیدر آباد کے بہرے حکیم صاحب کے پاس پہنچ رہے ہیں تو اس میں ڈھنا کیما۔ جو کوئے دار سے نکلنے تو سو سیار چلتے۔“

پیرس کی شاہراہ شاہزادیزے پر چلتے ہوئے انہوں نے عابد روڈ کا حال پوچھا۔ مارت کے گرجا گھر پر نوبت پہنچ کی خیریت پوچھی، لودف کے میوزیم میں سالار جنگ میوزیم کی حراج پری کی۔ وارسائی کے محل میں چو محلہ ہیلیس کا حال دریافت کیا۔ مارتے دیم کے گرجا گھر پر آل سینٹس کے گرجا گھر کی خیریت پوچھی۔ ہم نے جو اپافرانس کے صدر مسٹر مترال کا حال پوچھا تو انہوں نے اپنے حیدر آبادی دوست زنگ راؤ کا حال پوچھا۔ حیدر آباد مسرور خورشید کو پیرس میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

ہم یورپ کے حیدر آبادیوں کو نہیں کہا کہ امریکہ پہنچ تو احساس ہوا کہ امریکہ میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو گا جس میں حیدر آبادی آباد نہ ہوں۔ ہم اپنے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین اور ایک پاکستانی ڈاکٹر فرحت خاں کے ساتھ ڈھنگن سے ساحل میا می تک کے کئی ہزار میل کے سفر پر روانہ ہوئے تو امریکہ کی ریاست چارجیا سے گذرتے ہوئے ہمیں شام کے وقت ایک چھوٹا سا قصبه دکھائی دیا۔ غالباً تلاویگا نام تھا اس کا۔ پشاور کے ڈاکٹر فرحت خاں کو پہنچا یت ہے کہ حیدر آبادی نہ صرف سارے امریکہ میں پھیلیے ہوئے ہیں بلکہ ان کی تعداد امریکہ کے اصلی باشندوں ریٹن اف نیس سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کہیں سے پھر اٹھا تو اس کے پیچے سے ایک حیدر آبادی نژادی سلام کرتا ہوا ہم آمد ہوتا ہے۔ ہم نے کہا ”اس وقت ہم جس چھوٹے سے قصبے سے گذر رہے ہیں اس کی آبادی ہزار دو ہزار نفوں پر مشتمل ہوگی اس میں تو کوئی حیدر آبادی نہیں ہوگا۔“

فرحت خاں بولے ”لگائیئے اسی بات پر شرط۔“

ہمارے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”شرط نہ لگائیئے۔ آپ نقشان میں رہیں گے۔ ہمیں آج کی رات اسی قصبه میں رکنا ہے۔ میرا ایک حیدر آبادی دوست ڈاکٹر اسد یہاں رہتا ہے۔“

ڈاکٹر اسد جو چنچل کوڑہ کے رہنے والے ہیں اس چھوٹے سے قصبه میں ایک اپیسے مکان میں رہتے ہیں جو محل سے کم نہیں۔ مگر کے باہر تین چار موڑیں کھڑی تھیں۔ بہت خوش ہوئے مگر ان سے زیادہ ان کے والد ہم سے مل کر خوش ہوئے جو چھوٹیں تو امریکہ کے اس چھوٹے سے قصبه میں رہ رہے تھے۔ کہنے لگے چھوٹیں سے اپنے بیٹے کے سوائے کسی اور حیدر آبادی کی صورت نہیں دیکھی۔ میں تو امریکہ کی آسانیوں سے بیک آگیا ہوں۔ چنچل کوڑہ بہت یاد آتا ہے۔ ایک دو چھوٹیں میں واپس پلا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کو وہ اپنے بیٹے کا مکان اور جائیداد باشناصیل دکھانے لے گئے۔

ایک نیلہ پر کھڑے ہو کر انہوں نے کہنا شروع کیا ”وہ جو پہاڑ آپ دیکھ رہے ہیں وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ وہ جو بادلوں کے نیچے جنگل نظر آ رہے ہیں وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ یہ جھیل بہر رہی ہے، وہ بھی میرے بیٹے کی ہے۔“

ہم نے بڑے میاں کی بات کو کاٹ کر کہا ”اوہ وہ جو آسمان میں سورج چمک رہا ہے وہ کس کا ہے؟“

نور اپنے کافوں پر ہاتھ رکھ کر بولے ”نحوذ باللہ! اس سورج سے میرے بیٹے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کسی اور کا ہے۔“

شکا کو میں ہی ہمیں اپنے پرانے دوست عزیز الرحمن ملے، جنہوں نے اپنے اطمینان قلب کے لیے تھیٹ حیدر آبادی گالیوں کا تھیٹ انگریزی میں ترجمہ کر رکھا ہے، جنہیں وہ آئے دن ہسپانوی لیکسی ڈرائیوروں کو پابندی سے دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے پوچھا ”ہسپانوی ڈرائیور

مارٹن تو نہیں ہوتے؟“

بولے ”سچ پوچھئے تو حیدر آبادی گالیوں میں اتنی تحریک ہوتی ہے کہ یہ جب اردو میں عیبری نہیں معلوم ہوتی تو ترجمہ کی چھلنی سے گذرنے کے بعد انگریزی میں کیا بڑی معلوم ہوں گی۔ میں نے تو بس اپنے اطمینانِ قلب کے لیے ان کا ترجمہ کر رکھا ہے۔ چلو اپنے ڈھنگ سے گالی دے دی اور وہ مل مالوف سے اپنا رشتہ بنائے رکھا۔“

ہمیں شکا کو کے چخپل کوڑہ میں بھی جانے کا موقع ملا۔ یہاں زیادتر وعی لوگ رہتے ہیں جو پہلے حیدر آباد کے چخپل کوڑہ میں رہتے تھے۔ اس میں اور حیدر آباد کے چخپل کوڑہ میں کوئی ممائک نظر نہیں آتی۔ ایک صاحب نے اسی چخپل کوڑہ میں کھانے پر بلا یا تھا۔ تم نے ان سے پوچھا ”یہ کیا چخپل کوڑہ ہے جہاں بھینسیں نہیں بندھی ہوتی ہیں۔؟“

بولے ”بھینسیں تو ہمارے ذہنوں میں بندھی ہوتی ہیں۔“

پوچھا ”تو پھر دو دھنگی وعی دیتی ہوں گی۔“

ایک آہ بھر کر بولے ”اب اس ذکر کو جانے دیجئے کہاں شروع کیجئے۔ اللہ دیا ہے۔“

اچانک اس ”اللہ دیا“ کو سن کر ہمیں یقین آگیا کہ ہم سچ سچ حیدر آباد کے چخپل کوڑہ میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے ان صاحب سے کہا ”مگر ذرا سوچنے کہ اللہ نے آپ کو جو کچھ بھی دیا ہے وہ حیدر آباد سے کتنی دور لا کر دیا ہے۔“

اپنی آنکھوں میں آنسو لا کر بولے ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر اللہ نے اس کا دسوائی حصہ بھی ہمیں حیدر آباد میں دیا ہونا تو ہم چخپل کوڑہ کی گلیاں چھوڑ کر یہاں کیوں آتے۔“

ہم نے بات کو اور آگے نہیں بڑھایا کیونکہ آنسوان کی پلکوں پر چھکنے کو بیقرار تھے۔ اور ہمیں یوں لگا جیسے حیدر آباد ایک شہر نہیں بھیل کر کا نات بنا گیا ہے۔

اپرولٹ میں ہمارا پہلا سفر

جیان سوویت یونین (FRIENDS OF SOVIET UNION) کے سکریٹری جنگل کے آر گنیش ہمارے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو یہ وہی کے۔ آر گنیش ہیں جو سابق میں مرکزی وزیر نینا اس رہ چکے ہیں۔ اپنے دور وزارت میں انہوں نے اسمگنگ کے خلاف کچھ ایسے قدمات کئے تھے کہ اسمگر انہیں اب تک یاد کرتے ہیں۔ اس امتیازی وصف کے علاوہ وہ آرٹ، ادب اور بالخصوص اردو ادب کا بہت کھرا ذائقہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسمگروں اور اردو ادیبوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ایک دن انہوں نے ہم سے پوچھا ”آپ کبھی سوویت یونین گئے ہیں؟“

ہم نے دل میں سوچا، ہم کوئی ہیون سامنگ، ناہیان، یا ابھن بطور تھوڑے ہی ہیں کہ اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب کو چھوڑ، کندھوں پر ایک جھولا ڈال نئی نئی دنیاؤں کی ٹاش میں نکل کھڑے ہوں اور جب برسوں بعد زندگی کی شام ڈھلنے والپس ہوں تو پہنچ چلے کہ مسافر کی جھولی میں سفر کی یاد ہیں تو بہت ہیں لیکن وہن میں عزیز و اقارب اور بال بچوں کی تعداد میں کبی واقع ہو گئی ہے۔ سیاحت ان کے لئے ایک نصب ایمن تھی۔ ہمارے لئے ایک تفریح ہے۔ پھر کسی ہیون سامنگ یا کسی ابھن بطور کے ساتھ یہ بھی ہونا تھا کہ وہ کسی اجنبی دھرتی پر پہنچتا تھا تو وہاں کا حاکم اس کے ذوق سفر سے خوش ہو کر اس کا منہ موتویوں سے بھر دیتا تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب اجنبی دیس کا حاکم انسائیج کے سینہ یا پیٹ میں چھپے ہوئے موتویوں یا ہیرے جواہرات کو نکال لیتا ہے۔ (ہمارا اشارہ کشم والوں کی طرف ہے) ہمارے ہاں ذوق سفر تو بہت ہے لیکن اذوق سفر کی ہمیشہ کمی رہی۔

سوہم نے کچھ دیر سوچ کر کہا "گنیش جی! اما کہ ہم نے ملکوں ملکوں کی خاک ضرور چھائی ہے لیکن اسی وقت چھائی ہے جب اس خاک کو چھانے کا معاوضہ یعنی کراچی آمد و رفت کسی اور نے اور کیا ہو۔ ہم تو کب سے سودیت یونین جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں لیکن کسی ملک میں بن بلائے چلے جانا ہماری فقیرانہ شان کے خلاف ہے۔ آپ تو اب ہمارے سودیت یونین جانے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایک زمانہ ہم پر ایسا بھی گذر رہے جب ہم سالم رہیں اور اس کے انقلاب کو خود ہندوستان میں لانے کی بابت سوچا کرتے تھے۔" گنیش جی ہماری بات کوں کر خاموش ہو گئے جیسا کہ ان کی عادت ہے اور بعد میں ایک دن اچاک گنیش جی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ہیر ولی ممالک سے دوستانہ و ثقافتی تعلقات کی مرکزی سودیت انجمن اور سودیت یونین کی سودیت رہندوستی انجمن نے ان کی اس تجویز کو مان لیا ہے کہ اردو کے اوپر ہوں اور دانشوروں کے دو فنوں کو سودیت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت دی جائے۔ پہلا فندو دار کان پر مشتمل ہو گا ایک رکن تو آپ ہیں اور دوسرا رکن ہیں پروفیسر اشتیاق عابدی۔ ۲۷ ستمبر کو جانا ہو گا۔ کوچ کرنے کی تیاری کیجئے۔ اس اطلاع سے ہمیں دو ہری نہیز لگی۔ ایک تو سودیت یونین کا سفر اور اوپر سے اشتیاق عابدی جیسا ہمسفر نصیب آجائے تو کیا کہنے۔ وہ ہمارے ہم نوالہ، ہم پیالہ، ہم دم، ہم مشرب اور ہم مشروب تو ہیں ہی اب ہم رکاب اور ہم رکابی بھی بن جائیں گے۔ ہم رکابی پر ہمارا زور اس لئے ہے کہ وہ ہم جیسے ملنکوں کے دوست ہونے کے باوجود ماڈرن فنڈ افڈسٹریز کے چیزیں ہیں۔ سفر میں اور وہ بھی ہیر ولی سفر میں یہ ٹمائنیت کیا کچھ کم ہے کہ ہماری ماڈرن بریٹیڈ ہمارے ساتھ رہے گی۔

صا جبو! اس پس منظر کے ساتھ اب ہم سودیت یونیٹس، ایر و فلکوں کے وسیع و عریض طیارے میں بیٹھے ہیں۔ اس طیارے کو ہم نے اکثر اپنے گھر کے اوپر سے گذر کر دیلی کے ہوائی اڈے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی ساخت اور آواز دنیا کے مرچہ دیگر طیاروں سے مختلف ہوتی ہے۔ ہم تو اپنے گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی پتہ چلا لیتے ہیں کہ ایر و فلکوں کا طیارہ ہماری

چھت پر سے گذر رہا ہے۔

تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

ہم نے دنیا کی کئی ایر لائنز میں سفر کیا ہے لیکن ایر و فلکٹ میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ لوگوں نے کہہ رکھا ہے کہ ایر و فلکٹ کی ہوائی صیناوں کے ہفتوں پر اتنی مسکراہٹ نہیں ہوتی جتنی کہ اور ائیر لائنز کی ہوائی صیناوں کے ہفتوں پر ہوتی ہے۔ مسکراہٹ پر یاد آیا کہ بنکاک سے دہلی کے سفر میں تھا ای ایر ویز کی ایک موٹی ہی ایر ہوش تو ہم نے ایسی بھی دیکھی تھی جس کے ہفت ہی نہیں اس کی آنکھیں تک مسکراتی تھیں۔ پیشانی کھلکھلاتی تھی اور ہر و نہ تھامارتے تھے۔ اس کی آواز تک عجم ریز تھی۔ غرض اس کارروائی میں مسکراتا اور کھلکھلاتا ہوا ملا۔ اس بے نام دبے منزل مسکراہٹ کی یاد بھی ہماری آنکھوں کو کبھی کبھی لبریز کر دیتی ہے۔ خیر ہمیں اب مسکراہٹوں سے کیا لیتا دینا ہے۔ جو دے اس کا بھلا اور جوندے اس کا بھی بھلا۔ یوں بھی ہمیں تین گھنٹوں بعد ناشقند میں اتر جانا ہے۔ ایر ہوش دانے ڈنکے کو پوچھ لے بھی کافی ہے۔ نہ ہم یہ بات ضرور ہے کہ ایر و فلکٹ کے طیاروں میں بیٹھنے کے لئے وہ فراہت نہیں ہوتی جو عام جمبو جٹ طیاروں میں ہوتی ہے۔ پاؤں تو آپ پسارہی سکتے ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ آپ کو دیکھنے والے کو یہ گمان گزرے کہ آپ رحلت فرمائچے ہیں اور یہ کہ آپ کی بے کور و کفن لعشن شست پر بے حس و حرکت پڑی ہے۔ طیاروں میں ہم اس انداز نشست و برخاست کے قابل نہیں ہیں۔ اس لئے ایر و فلکٹ کی نشتیں کم از کم ہماری شخصی شاشگی اور ذاتی تمدن کے عین مطابق نظر آئیں۔ آدمی پاؤں پسارے گا بھی تو باہر تھوڑی جائے گا اور میاں یہ طیارہ ہے کوئی گھر تو ہے نہیں کہ آپ کھانے کی میز پر پاؤں رکھنے کو دیں کھانے کی پیٹ سجائے کھانا کھانے لگ جائیں۔ یہ سب پیٹ بھروں کے چوچلے ہیں ہم تو بسوں کے ڈنڈوں سے لٹک کر سفر کرنے کے عادی ہیں۔ اب ایر و فلکٹ میں کشاوہ اور آرام وہ نشتوں کے طلبگار کیونکر ہوں۔

ہمارا حلقة احباب کتنا وسیع ہے اس کا اندازہ تو ہمیں طیارے کے اندر پہنچنے پر ہی ہوا۔ ایک

طرف ہمارے سیارولد ار ارجمن دیو بیٹھے ہیں جو نارتھ کے پروفیسر ہیں، وہری طرف تلگودشم کے رکن پارلیمنٹ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں سماجیات کے پروفیسر ڈاکٹر لکھنہا بیٹھے ہیں۔ یہ دونوں برلن میں ہونے والی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں۔ تیسرا طرف ہفتہ وارنی دنیا کے ایڈیٹر شاہد صدیقی اور صحافی شمس الزماں بیٹھے ہیں جو باکو میں ہونے والی کسی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیئے جا رہے ہیں۔ مولانا اسحاق سنبھلی بھی یہیں کہیں ہیں۔ اگلی نشتوں پر محترمہ شیلا کول سابق مرکزی وزیر تعلیم بھی بر اجمان ہیں جو ناشقد میں ہونے والی خواتین کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہی ہیں۔ باقی وہ مسافر ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے مگر قیاس اٹلب ہے کہ وہ بھی یقیناً کسی اچھی سی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے ہوں گے۔

طیارے گورات کے دس بج کر ۲۴۰۷ پر اڑنا تھا لیکن روائی میں دیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ایر ملکوں کی ہوائی حسیناؤں نے اپا انکے مسافروں کو گذنا شروع کر دیا۔ ہم نے کہا یا اللہ یہ مسافروں کو گذنے کا کیا سلسہ ہے پھر سب کے ٹکٹوں کو چیک کرنے کی باری آئی۔ روی زبان میں کچھ اعلان بھی ہوا۔ انگریزی میں بھی کچھ بولا گیا جس پر روی لہجہ کا لکف کچھ اتنا زیادہ چڑھا ہوا تھا کہ اپنے مطلب کی انگریزی ہمارے پانیں پڑا۔ کسی نے کہا ”شاید کوئی مسافر بلا انکٹ سوار ہو گیا ہے اس کی تلاش ہو رہی ہے۔“ پھر ایر ہوش نے بعض مسافروں کو اٹھا کر کچھ پوچھنا شروع کیا۔ یہ معتمد کچھ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں ایر ہوش ہاتھوں میں کوئی آله پڑے شمودار ہو گئی اور طیارے کی رہد اری میں ایک سرے سے دھرے تک آله کے ہٹن کو دباتی اور چھوڑتی ہوئی چلنے لگیں۔ ان آلوں کے بخنز کی آواز سے یوں لگا جیسے سوریا ہو گیا ہے اور چڑیوں نے چپھما شروع کر دیا ہو۔ ہم نے اشتیاق عابدی سے پوچھا ”یہ کیا ماجد ہے۔“

وہ بولے ”طیاروں کے انداز کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پیش نظر یہ کوئی احتیاطی مددیر لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس آله کے ذریعہ ہتھیاروں کا پتہ چلا دیا جا رہا ہو۔“ یہ سنتے ہی ہمارے پیسے چھوٹ گئے کیونکہ ہماری جیب میں چاہیوں کا جو چھلار کھا ہوا ہے اس میں ایک چھوٹا سے چاٹو بھی

موجود ہے۔ یہ چاقو ہم نے طیارہ کو اندازے کے ارادہ سے نہیں رکھا بلکہ اس کا مقصد ناشپاتی، امر و اور اسی قسم کے دیگر پھلوں کو کافی ہے۔ مباوا یہ نہ سمجھتے کہ ہم پھل کھانے کے بہت شوقیں ہیں۔ یاد آتا ہے کہ زندگی میں صرف ایک بار چاقو کی مدد سے ایک سب کو کافی کوشش کی تھی۔ سب تو نہیں کہا تھا البتہ انگلی ضرور کث گئی تھی۔ اب جو یہ چاقو بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں تو اس کا پس منظر صرف اتنا ہے کہ دوستوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ازبکستان میں پھل بہت ملتے ہیں۔ تمہارے سامنے پھل تو بہت ہوں گے اور چاقو تمہارے پاس نہ ہو تو کیا کرو گے؟ ہند روپی دوستی کے سچے چند بے کا تناقض بھی یہی ہے کہ پھل اگر سودیت یونیں کے ہوں تو ان پھلوں کو کافی کے لئے جو چاقو استعمال ہو وہ کم از کم ہندوستانی ضرور ہونا چاہیے۔ یک طرفہ دوستی یوں بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ لہذا و طرفہ دوستی کے ثبوت کے طور پر یہ چاقو ہماری جیب میں پڑا ہوا ہے۔

طیارہ کی روائی میں ایک گھنٹہ کی تاخیر ہو گئی تھی کہ اچانک طیارہ نے رن وے پر دوزنا شروع کر دیا۔ اب ہم ہوا میں ہیں۔ زمین سے جب بھی ہمارا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو نہ جانے یہ دھرتی اتنی خوبصورت کیوں نظر آنے لگتی ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ طیارہ جب اپنی مقررہ اوپھائی پر پہنچ جائے گا تو ہمیشہ کی طرح ہوائی حسیناً میں اچانک جلوہ گر ہوں گی اور یہ بتانا شروع کریں گی کہ ہوائی حادثہ کی صورت میں آپ کو کہر سے راہ فرار اختیار کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں ہوائی حسیناؤں کی یہ مشقیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جب بہت دیر تک ایریہ سس جلوہ افراد زندہ ہوئیں تو کسی نے بتایا کہ ایریہ ملکوں میں یہ تماشے نہیں دکھائے جاتے۔ جب کوئی حادثہ ہونا ہی نہیں تو خواہ مخواہ مسافروں کا دل کیوں دبلا�ا جائے۔ ہم نے کہا ”اگر حادثہ نہیں ہونا تو کرتب نہ دکھاؤ۔ تمہاری مرضی۔ مگر خدا کے لئے کھانا تو کھلاؤ۔ اب طیارے کو دھرتی سے اٹھائے کوئی ایک گھنٹہ بیت پکا ہے۔ سازھے بارہ بجئے کو ہیں۔ ہوائی سفر کی بیت میں ہم کھانا کھائے بغیر آٹھ بجے ہی ہوائی اڈہ پر آگئے تھے۔“ کسی نے کہا ”ایریہ ملکوں میں کھانا مسافر کی بھوک کے حساب سے نہیں آتا بلکہ جب ایریہ سس کو بھوک لگے گی تو وہ خود کھانا لے آئے گی۔“

ابھی ہم اس دلچسپ ریمارک سے لاف انداز ہوئی رہے تھے کہ ایر ہوش اپنے پورے مطہن اور نام جہام کے ساتھ نمودار ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری نشتوں پر لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ہمیں تو ایر ہنگوت کا کھانا بھی اچھا لگا۔ لوگوں نے خواہ مخواہ ہی ایر ہنگوت سے ڈر ار کھا تھا۔ کھانے سے قارغ ہو کر گھڑی دیکھی تو ہوائی سفر کے دیکھنے بیت چکے تھے۔ پون گھنہ پا ایک گھنہ اور بیت جائے تو ہم ناشقند میں ہوں گے۔

کھڑکی سے باہر جھاٹک کر دیکھا تو چاروں طرف اندر ہیرا ہی اندر ہیرا تھا۔ ہم شاید ہمایہ سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں کہیں سے صد یوں پہلے آریہ ہندوستان آئے تھے۔ سکندر عظیم بھی دنیا کو فتح کرنے کے ارادہ سے ہمیں سے گزر ا تھا۔ کتنی تکلیفیں اٹھا کر آیا تھا۔ اس زمانے میں ایر ہنگوت کیاں تھیں کہ کشم کی جانچ اور سکوریٹی چیک کرو ا کے پلک تھیکنے میں خفا ظقی بھی باندھ کر چلا آتا۔ یقچے اس علاقہ میں وہ غار بھی ہوگا جس میں ہا کام وہ ماراد تیمور لگ دشمنوں سے گھرا کر پناہ لینے آیا تھا اور اس کی ملاقات اس چیوٹی سے ہوئی تھی جواناچ کے ایک وزنی وانہ کو اٹھا کر اوپر لے جانے کی کوشش میں بار بار یقچے گر جاتی تھی۔ سینکڑوں باروہ گری مگر بالآخر دانہ کو اوپر لے جا کر ہی دم لیا۔ چیوٹی نے اماج کے اس دانہ کے ساتھ کیا سلوک کیا مورثین اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ چیوٹی کا پیغمبر اور حوصلہ بعد میں تیمور لگ کا عزم اور حوصلہ بن گیا۔ وہ غار سے نکلا تو ایر تیمور بن چکا تھا۔ اس کی سلطنت سارے وسط ایشاء کی سرحدوں کو پھلانگ گئی۔ ملک گیری کے شوق میں اس نے جگہ جگہ انسانی سروں کے بینار کھڑے کئے۔ تاریخ امیر تیمور کو یاد کرتی ہے لیکن چیوٹی کو بالکل بھول جاتی ہے۔ یہ ہمارے کانوں میں کیسی آواز یہی آری ہیں۔ کہیں یہ چنگیز خاں کے گھوڑوں کے ہاپوں کی آواز تو نہیں ہے۔ وہ بھی تو اپنے دولاکھ گھڑ سواروں کے ہمراہ تہذیب یوں کلستان مٹانا ہوا ہمیں سے تو گزر ا تھا۔ نہ جانے وہ گھوڑے کیا ہوئے۔ تاریخ ان گھوڑوں کی شجاعت کو یاد نہیں کرتی۔ صرف چنگیز خاں کو یاد کرتی ہے۔ شاید یہ چنگیز خاں کا ہی لشکر ہے۔

ڈراسنوکیسی بہت اک آواز ہیں آرہی ہیں۔ ارنے نہیں یہ تو ہر ٹلوٹ کے طیارے کے نیچے اترنے کا سلسلہ ہے۔ تاریخ کے صفحوں اب بھر جاؤ۔ ہمارے ذہن میں اللئے پلٹنے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں تاشقند کی جگہ گاتی روہیوں میں کھو جانے دو۔ حد نظر تک کیسی خوشنما اور دلاؤ دیز رہنمیاں ہیں۔ حال کی روشنی جب سامنے ہو تو ماضی کی تاریکیوں کو کون یاد کرے سما ادب بالا حظہ ہو شیارا اب ہم کچھ یہ دیر میں ازبکستان کی راجدھانی تاشقند میں اترنے والے ہیں۔ پتہ نہیں یہ شہر ہمیں کیسی کیسی یادیں عطا کرنے والا ہے۔ ہم اس شہر کو فتح کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں، ہمارے ساتھ نہ لاؤ شکر ہے نہ نام جہاں۔ ہم تو اپنا ول ہتھیلی میں لئے اس شہر نگاراں کے دروازے پر کھڑے ہیں۔

جودلوں کو فتح کر لے وہی قاتح زمانہ



ہم تا شقند سے بول رہے ہیں

ہم نا شقند کے ہوئی ازبکستان کے کمرہ نمبر ۷۳ سے بول رہے ہیں۔ ہندوستانی وقت کے مطابق ہم رات کے تین بجے نا شقند پہنچتے۔ ازبکستان اور ہندوستان کی دوستی کی انجمن کے سکریٹری اسی بجے ایگزینڈ روچ ہمیں لینے کے لیے ہوا۔ اڑے پر آگئے تھے۔ وہ ہڑے تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ ہم سے ملا چاہتے تھے لیکن ہم نے انہیں منع کیا۔ کہ رات کے تین بجے ہمارے پاس انہیں جوابی تپاک نہیں ملے گا۔ اس رسم کو صحیح کے لئے اخبار کھئے۔ خوابیدہ نا شقند کو اور اس کی وہی شاہراہوں اور اوپنی عمارتوں کو اپنی شم خوابیدہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ہوئی پہنچ۔ ایگزینڈ روچ نے ہم سے کہا کہ ہم اپنی گھریوں کو بیس منت آگے کر کے اب اوقت بن جائیں کیونکہ نا شقند کا وقت دلی کے وقت سے بیس منت آگے ہے۔ آج ہی سے نیا وقت لا کو ہوا ہے۔ اگر آپ ایک دن پہلے آجاتے تو آپ کو اپنی گھریوں کو ایک گھنٹہ بیس منت آگے کرنا پڑتا۔ ہم نے کہا چلو بچت کی کوئی صورت تو نکل آئی ورنہ ہم تو ہمیشہ گھانٹے کا سودا کرتے آئے ہیں۔ بیر و نی سفر میں ہمیں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ہماری گھری کو ہوتی ہے۔ بھری یہ تو سودیت یونیں ہے جہاں وقت کے سات مسلطے ہیں۔ اس کے مشرق کے شہر اور مغرب کے شہر کے درمیان وقت کے معاملے میں تقریباً سات گھنٹوں کا فرق ہے۔ جو ملک دوسرے عظموں میں پھیلا ہوگا اس کا یہی حشر ہوگا۔ ایگزینڈر، ہوئی سے جانے لگے تو اس وقت ہماری گھری میں نا شقند کے وقت کے حساب سے چار بجے رہے تھے۔ وہ بولے ”صحیح ٹھیک آٹھ بجے ہوئی کی لائی میں آ جائیں۔ دوستی انجمن کے عہدیدہ از بھی آئیں گے۔ ساتھ میں ما شیر بھی ہوگا اور دن بھر کا سارا پروگرام آپ کو بتا دیا جائے گا۔“ ہم نے کہا ”بندہ خدا! ہم تو آئے ہی سودیت یونیں کو دیکھنے کے لئے۔ آپ دکھانے کے

لئے جتنے بے چین ہیں اس تھے ہی دیکھنے کے لئے ہم بھی اتاوے میں مگر ذرا ہمیں اپنی کمر تو سیدھی کر لینے دو۔ رات اب جانے کو ہے اس کے جاتے جاتے کوئی چھوٹا سا حسین خواب دیکھ لیں تو کیا مفہاٹقہ ہے۔ آٹھ بجے کی بجائے دس بجے میں تو کیمار ہے گا۔ آپ اطمینان رکھیں اس تبدیلی سے ہندو روس دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“

ہمیں یاد ہیں کہ الیکزینڈر کے چلے جانے کے بعد ہم نے اپنی کرسیدھی کی بھی یا نہیں۔ نیند کو لانے کے ان لوازمات کا کسے ہوش تھا۔ آنکھ کھلی تو آٹھ نجح رہے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو صبح بہت روشن تھی۔ دور دوستک اوپنجے اوپنجے درختوں کے ساتھ اوپنجی اوپنجی عمارتیں نظر آئیں۔ کھڑکی کے سامنے جو وسیع شاہراہ تھی اس پر موڑیں، بسیں، ٹرائیں دوڑی چلی جاری تھیں۔ تاشقند کب کا جاگ چکا تھا۔ اس بھاگتی دوستی زندگی کو دیکھ کر ہم میں چستی اور پھر تی کی لمبی دوڑگنی۔ فانٹ اپنے آپ کو تیار کیا اور ٹھیک دس بجے لاپی میں پہنچے۔ الیکزینڈر ویچ حسب وحدہ لاپی میں موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ایک متین سنجیدہ اور بد و بار خاتون کھڑی تھیں۔ الیکزینڈر نے کہا ”ان سے ملنے یہ ہیں ڈاکٹر لیدیا کیمپریکٹس، ماسکو کے بین الاقوامی تعلقات کے انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہیں۔ یہ مرکزی دوستی انجمن کی طرف سے آپ کے استقبال کے لئے خاص طور پر ماسکو سے آئی ہیں۔ سو ویہت یونیون کے سارے دورہ میں یہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ ان کے ہمراہ ایک اور صاحب کھڑے تھے غنور جہاں گستربی تاشقند میں سو ویہت یونیون کا جوب سے برداشت اتنا عتی مرکز ”زادوگا“ کے نام سے قائم ہے اس میں اردو زبان کے لیڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ یہ ازبک ہند دوستی انجمن کی طرف سے آئے تھے۔ ازبکستان کے سارے دورہ میں یہ ہمارے ساتھ رہے۔ ان کے پارے میں الگ مضمون لکھیں گے جس کے کوہ متعلق ہیں۔ فی الحال ڈاکٹر لیدیا کا ذکر ہو جائے۔ ماشتبہ کی میز پر ہم نے ان سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے سلیس اردو میں جواب دے کر اردو کے مستقبل کے تعلق سے ہماری ما یوکی کوہی طور پر عی کی دوڑ کر دیا۔ پہتہ چلا کہ اردو اور ہندی کی اسکالر ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی انسانہ نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھ چکی ہیں۔ اتنی عی مرتبہ ہندوستان آچکی ہیں جتنی مرتبہ ہم دلی سے حیدر آباد گئے ہیں۔ ہمیں تو

سائھ بائی مرس کی خاتون نظر آئیں۔ مگر جب ہم نے ان کی عمر پوچھی تو انہم سے اور اشتیاق عابدی سے ہماری مردیہ عمریں پوچھ دیتیں۔ ہم نے اپنی عمر پیچاں مرس بتائی اور اشتیاق عابدی ۶۵ مرس پر رک گئے۔ ڈاکٹر لیدیا کچھ دیر اس طرح سوچتا رہیں جیسے اپنے لئے کسی سہولت بخش عمر کا اختیاب کر رہی ہوں۔ بولیں ”میں ۵۳ مرس کی ہوں۔“ یہ سنتے ہی ہم نے بر سر موقع انہیں اپنی بہن بنالیا۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہندستان میں بھی ہماری کوئی بہن نہیں ہے۔ ایک چھاڑ او بہن تھی جس سے ہم نے بعد میں شادی کر لی۔ اب روس میں آپ جیسی قابل اور لاکن بہن مل جائے تو کیا کہنے۔ یوں بھی آپ کے نام کا آخری حصہ یعنی ”کبریکشنس“ بولنے میں کچھ اتنا لفظ ہے کہ ہماری زبان سے اوانہ ہو گا۔ ”کبریکشنس“ کی جگہ آپ انگلی کر ”لیدیا آپا“ بولا جائے تو آپ کا نام خاصار وال ہو جائے گا اور ہم کسی خاص محنت مشقت کے بغیر سو ویت یونین کے دورہ سے لف اندوز ہو سکیں گے۔ اشتیاق عابدی بھی ”کبریکشنس“ سے فکر مند تھے۔ بولے میں بھی آپ کو ”لیدیا آپا“ کہوں گا۔ نہ کہ بولیں ”عابدی بھائی! اگر چہ آپ مجھ سے عمر میں ہڑے ہیں لیکن پھر بھی آپ کے لیدیا کہنے سے دملکوں کی دوستی کو فروغ حاصل ہونا ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

ناشیت کے بعد، ہم نا شقند کی سیر کو نہلے۔ کیا صاف سترہ اور کشاورہ شہر ہے۔ ازبکستان جس کی کو دیں کئی تہذیبیں پرداں چڑھیں، آبادی کے اختبار سے سو ویت یونین کی چوتھی بڑی جمہوریہ ہے اور اس کی راجدھانی نا شقند کو سو ویت یونین کا چوتھا بڑا شہر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ازبکستان کی تاریخ ہزاروں مرس پر اُنی ہے۔ سکندر اعظم بھی یہاں آیا تھا۔ ساتویں صدی میں عرب اسلام کو لے کر یہاں آئے۔ کیسے کیسے عالم، کیسی کیسی جلیل القدر، ستیاں یہاں پیدا ہوئی ہیں۔ آٹھویں صدی کے اختتام اور نویں صدی کے آغاز میں علم الجبرا کے بانی محمد ابن موسی الخوارزم کا مسکن بھی تھا۔ مشہور ریاضی داں احمد الفرغانی بھی اسی عرصہ میں یہاں رہتا تھا۔ مشرق کے اسطو الفارابی کا دملن بھی بھی تھا۔ مشہور دانشور اور طبیب ابن سینا اور ابو ریحان البیرونی بخارا میں رہتے تھے۔ پھر چنگیز خاں کے لشکر نے اس تہذیب کو روک دا۔ امیر تمور نے یہاں ایک عظیم

الشان سلطنت ہاتھم کی جس کی سرحدیں ایشیاء سے نکل کر یوروپ تک چلی گئی تھیں۔ تیمور اور اس کے جانشینوں بالخصوص اس کے پوتے لفغہ بیگ کے عہد حکومت میں سر قدم اور بخارا کا شمار دنیا کے عظیم شہروں میں ہونے لگا۔ ہندستان میں مغل سلطنت کا باقی ظہیر الدین بابر بھی یہیں سے آیا تھا۔ ازبکستان کا چھپہ چھپہ ماضی کی تاریخ کا امین ہے۔

ہم ہوںک سے باہر نظر تو ناشقند کا موسم و بلی کی طرح ہی لگا۔ ازبکستان ہوںک جس میں ہمارا قیام ہے، انقلاب چوک میں واقع ہے، بیحد خوبصورت جگہ ہے۔ سامنے ہی ازبکستان کے اوپوں کی انجمن کا دفتر ہے۔ ہم نے یعنی چوک بھی دیکھا جہاں ازبکستان کی پریم سودیت کی عمارت واقع ہے۔ بہت پرنسپا مقام ہے۔ چاروں طرف خوبصورت باغی ہیں، فوارے الگ چل رہے ہیں۔ اس شہر کی زیادہ تر عمارتیں اپریل ۱۹۶۲ء میں ناشقند کے زلزلے کے بعد بنی ہیں۔ یعنی کا ایک بھاری مجسم بیچوں پیچ نصب ہے۔ ازبک اوب کے باقی علی شیر نوائی کے نام پر یہاں جو شاہراہ ہے وہ ناشقند کی سب سے بڑی شاہراہ ہے۔ دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ ناشقند کے ایک پارک میں ہندستان کے دہرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا ایک خوبصورت مجسم بھی نصب ہے۔ آنجمہ انی شاستری نے جنوری ۱۹۶۲ء میں اس وقت کے صدر پاکستان ایوب خاں کے ساتھ ناشقند معاملہ پر دستخط کئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔

قوموں کی دوستی کا چوک اور محل دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہیں ایک لوہا را اس کی بیوی اور ان کے گولٹے ہوئے چودہ بیچوں کا مجسم ہے جسے دیکھ کر انسان دوستی اور عالمی اسکن پر آدمی کا یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ اس مجسم کا قسم پیپر ہے کہ دہری جنگ عظیم کے بعد جب سارے سو دیت یونیون میں تیم دیسیر اور بے سہارا بیچوں کی تعداد بڑھ گئی تھی تو ناشقند کے ایک لوہا راجہ شاہ محمود دوف اور اس کی بیوی نے مختلف قومیوں کے چودہ تیم بیچوں کو گولے لیا تھا اور انہیں وہ پیار اور تربیت دی تھی جو شاید ان کے اصلی ماں باپ بھی نہ دے سکتے تھے۔ راجہ شاہ محمود دوف تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں البتہ ہمیں بتایا گیا کہ ان کی بیوی بھی تک زندہ ہیں اور یہ چودہ پیچے جواب بڑے ہو

چکے ہیں سو دیت یونیٹ کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان میں کچھ مرچکے ہیں۔ جوز ندہ ہیں وہ اپنی ماں سے ملنے اکثر نا شقند آتے رہتے ہیں۔ ایسا پر شکوہ اور اڑ انگیز بھسہ ہے کہ جیل گا نار دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔

نا شقند کی عالیشان عمارتوں اور سیچ و عریض سڑکوں کو دیکھے تو ہم نے خور جہاں گستاخی سے کہا ”جناب والا آپ کے ہاں کوئی پرانا نا شقند بھی ہو گا اسے دکھائیں۔“ اور تھوڑی دیر بعد ہم پرانے نا شقند میں تھے۔ ازبک ٹوپیاں اور گپڑیاں باندھے ہوئے لوگ سڑکوں سے گذر رہے تھے۔ تجھ گلیاں، ان گلیوں میں ہتھی ہوئی سوریاں، سر راہ کباب اور چلیں بیچنے والے، تھوڑے پیچے ہوئے خوش گلیوں میں مصروف لوگ۔ ان سب کو دیکھ کر ہمیں یوں لگا جیسے ہم پرانی ولی کے کسی علاقے سے گذر رہے ہیں۔ گلیوں کے دونوں طرف یک منزلہ عمارتیں ہیں۔ باہر سے اکثر بوسیدہ نظر آتی ہیں۔ مگر نہ ہے کہ اندر سے بھی جھائی ہیں۔ شہر کے اس حصہ میں سب سے اوپری عمارت مسجد سکھ شیخ کا مینار ہے۔ یہ محلہ سو دیت مشرق کا اسلامی مرکز ہے اور یہاں وسط ایشیاء اور قزاقستان کے مسلمانوں کا ادارہ دینیات واقع ہے۔ اس ادارہ کے سربراہ مفتی مسیح الدین ابن فیاض الدین ذیشان اس دن باکو گئے ہوئے تھے جہاں بین الاقوامی اسلامی کافرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس ادارہ کے برادری نا شقند کے مشہور عالم اور مفتی امام کمال شاشی کا مقبرہ ہے۔ مفتی کمال شاشی نے ایک طویل عرصہ بغداد میں گذرا تھا۔ جب وہ نا شقند واپس ہونے لگے تو بغداد کے اس وقت کے خلیفہ نے ان کی علمی و دینی خدمات سے متاثر ہو کر انہیں قرآن کا وہ نسخہ تحفہ میں دیا تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ کہا جانا ہے کہ اس کے ایک صفحہ پر جو دھبہ ہے ہیں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے ہیں۔ یہ نسخہ بعد میں پیٹریس برگ چلا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے انقلاب کے بعد یعنی کوئی دشمن شدہ فرمان کے مطابق قرآن پاک کا یہ نسخہ سو دیت مشرق کے مسلمانوں کے حوالہ کر دیا گیا اور آج بھی یہاں محفوظ ہے۔ نا شقند کا ادارہ دینیات سو دیت یونیٹ کے مسلمانوں کے چار مذہبی مرکزوں میں سے ایک ہے۔ یہ ادارہ سو دیت مشرق کی پانچ جمہوریتوں قزاقستان، ازبکستان، تاجکستان، کرغز یا اور ترکمانیہ کی

مسجدوں اور مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کو تحدیکرتا ہے۔ اس ادارہ کے تحت دینی تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ اس کے کتب خانے میں تیس ہزار دینی کتابیں ہیں جن میں سے اکثر مایاں ہیں۔ ادارہ دینیات اور مسجدوں کے لئے مالی وسائل و بینداروں کے عطیوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ناشقند کے زلزلے سے متاثر ہونے والے خامد انوں کی امداد کے لئے ادارہ دینیات نے دولا کو روپیل (موجودہ شرح مبارکہ کے مطابق ایک روپیل سولہ ہندوستانی روپیل کے برابر ہوتا ہے) عطا ہے اپنے فنڈ سے دیا تھا۔ اسی ادارے نے قرآن شریف کے کئی ایڈیشن شائع کئے ہیں۔ وہہر سال قمری جنتری اور دیگر مذہبی رسائل شائع کرتا ہے۔

ہم جب اس ادارے میں گئے تو دوپہر کا وقت تھا اور دن اتوار کا تھا۔ مسجد کا صحن کافی بڑا ہے۔ پتہ چلا کہ جمعہ کی نماز کے وقت صحن نمازوں سے بھر جاتا ہے۔ مسجد کے ایک حصہ کی تعمیر زور دشور سے جاری تھی۔ لیکن ہمیں سب سے زیادہ لمحے کی ان نوجوان جوڑوں سے تھی جو عروی لباس پہنے جو ق در جو ق ادارے میں آرہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ جوڑے اسلامی طریقے سے نکاح پڑھوانے آرہے ہیں۔ سوداہت تائون کے مطابق ہر شادی کا رجسٹریشن ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی چاہیے تو مذہبی طریقے سے بھی شادی رچاسکتا ہے۔ چونکہ اتوار کو چھٹی کا دن ہوتا ہے اسی لئے نوجوان جوڑے اس دن ادارہ دینیات میں آتے ہیں۔ نوجوان جوڑے زرق بر ق لباس پہنے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ موڑوں میں لدے پھندے آرہے تھے۔ مسجد میں ایک میلہ کا سامگمان ہوا تھا۔ السلام علیکم، علیکم السلام اور مرحمت (شکریہ) کے الفاظ بار بار سنائی دیئے۔ ہم نے بعض جوڑوں کو مبارک باد دی۔ دہنیں ہماری مبارک باد سے بہت خوش ہو رہی تھیں اور ”مرحمت، مرحمت“ کی رٹ لگادی تھیں۔ ایک دہن کا نام پوچھا تو اس کا نام مشکورہ نکلا۔ دہری سے پوچھا تو وہ ماہرہ نکلی۔ تیری جوٹی تو عاتش تھی۔ مشکورہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر ہم سے ازبک میں پوچھا ”پر دیکی یہ تو بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں؟“ ہمارے مترجم تھے غفور جہاں گستردی۔ ہم نے کہا ”بی بی! آپ کے دو لہا میاں آپ کے ساتھ ہیں اسی لئے ہم سے صحیح جواب کی توقع نہ رکھو۔ یہ تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم بتاتے کہ تم کیسی لگ رہی ہو۔ کیا تم صحیح مج اس دنیا کی مخلوق

ہو؟ ”غفور جہاں گستربی نے ہماری اردو کانفرنس کیا کہ اب کی بار و دلہما میاں ہمارے سر ہو گئے کہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ ہم نے سوچا کہ غفور صاحب نے ضرور ترجمہ کا گھپلا کیا ہے ورنہ جہاں ہمیں رسولی ملنی چاہیے تھی وہاں ہمارے حصہ میں نیک نامی کیسے آگئی۔ کھانے کے معاملے میں غفور صاحب کی نیت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ کہنے لگے کہ آپ شادی کی دعوت میں چلیں تو آپ کو از پک کھانوں سے لطف انداز ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔ مگر ہم نے دلہما میاں سے مغدرت کی کہ بھیتا! ایک لکھنؤی دوست منظر سیم نا شفند میں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ رات کے کھانے کی بات پہلے سے طے ہو چکی ہے۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ آپ کی دعوت میں شرکت کریں، ایسی محبت ہمیں پھر کہاں ملے گی۔ مگر پھر وہی منظر سیم ہائے منظر سیم اتم ہندوستان میں کبھی نہیں ملے۔ اب نا شفند میں ملے بھی تو کب ملے۔ باول نخواستہ نوجوان جوڑوں سے اجازت لے کر مشہور عالم مدرسہ کوکتاش اور بر ق خاں کے مدرسہ کو دیکھنے گئے۔ یہ دونوں مدرسے سولہویں صدی ہیسوی میں شیباںی خاں کے دور حکومت میں بنے تھے۔ ان مدرسوں کو جس طرح محفوظ رکھا گیا ہے انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ عمارتیں ابھی ابھی بنی ہیں۔



ہم نے اردو میں از بیک کھانا کھایا

ہم جب بھی بیرونی سفر پر جاتے ہیں تو کم از کم پیٹ کی بھوک کے معاملے میں یہ احتیاط ضرور کرتے ہیں کہ بھوک اُسی وقت لگے جب ہمارا یا ہماری ترجمہ ہمارے ساتھ ہوں۔ اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں اکثر یا بھی ہوا کہ ہم نے اذکار کھانا چاہا اور بیرے نے سالم مرغ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیا۔ مرغ اور اندھے کا تو خیر ایک رسمی اور غیر رسمی سارشستہ بھی ہے۔ پیرس میں ہم نے اشاروں کی مدد سے آنکھریم کھانی چاہی تھی اور بیرے نے ان اشاروں کا سلیمانی ترجمہ سور کے کوشت کے قلعوں کی شکل میں لا کر رکھ دیا تھا۔ کھانے کے معاملے میں اتنی جدید پیٹ کے ہم تاکل نہیں ہیں۔ بیرونی سفر کے اس وسیع تجربہ کی روشنی میں ہم نے ازبکستان میں حتی الامکان یہ کوشش کی کہ مترجم کی غیر موجودگی میں ہمیں بھوک نہ لگنے پائے۔ بھی وجہ ہے کہ مترجم کی موجودگی میں ہم کھانے کے سوائے کوئی اور کام ہی نہیں کرتے۔ اسے ہمارا جذبہ حب الوطنی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ وطن عزیز میں ہمیں بڑی مشکل سے بھوک لگتی ہے مگر جیسے ہی وطن سے باہر قدم نکالتے ہیں بھوک کچھ اس زور سے چمکتی ہے کہ بچلی بھی کیا چمکے گی۔ ہم نے ازبیک میزبانوں سے کہہ رکھا ہے کہ ہندوستان میں ہمارا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہے اور یہ کہ ہمارے معدہ کو مرغی غذاوں سے خاص رغبت ہے اور سیدھی سادی غذاوں سے ہمارا ہاضمہ خراب ہو جانا ہے۔ ہم تو ناشتے میں ہی اتنا کھا جاتے ہیں کہ وطن عزیز میں پورے دن بھر میں اتنا کھانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس پر مستر اودو پہر کا کھانا، شام کا ناشتہ اور رات کا کھانا الگ کھا جاتے ہیں جو وطن میں ہماری ایک ہفتہ کی غذا کے برادر ہو جاتا ہے۔ کھانے کے معاملہ میں اتنی احتیاط کے باوجود ایک سہ پہر کو اچانک بھوک نے زور مارا۔ ہم نے اپنے مترجم کو کہہ رکھا تھا کہ وہ ہمیں گھنٹی بھر آرام کرنے کا

موقع عنایت کریں۔ وہ جا چکے تو بھوک آگئی۔ بھوک کے ہم کچھ تو ہیں ہی، اکیلے ہی ہوں گے ازبکستان کے ڈائینگ ہل میں چھپ گئے۔ بیرے کو بلا کر اپنے دانتوں میں دو انگلیاں ڈالیں اور لگھے چبانے۔ بیرا بہت ہوشیار تھا۔ ہمارے اشارے کو بھانپ کر ازبیک میں پوچھا ”کوشت؟“ ہم نے اردو میں کہا ”ہاں ہاں کوشت۔“ پھر پنے ہاتھوں سے پیالے کی ایک شکل بنائی اور ہاتھ کو بلا بلا کر اس میں لہریں سی چلا نے لگے۔ ہمارے اس اردو اشارے کا مطلب یہ تھا کہ پیالے میں کوشت کا شور بسلے آؤ۔ بیرے نے ازبیک میں پوچھا ”پیالہ؟“

ہم نے اردو میں کہا ”ہاں ہاں پیالہ۔“ پھر پیالے میں چلنے والے ہمارے ہاتھ کی لہروں کے اشارے کو ناڑ کر بیرے نے ازبیک میں پوچھا ”شور پا؟“

ہم نے کہا ”ہاں ہاں شور پا۔ اگرچہ ہم اردو میں ایک نقطہ والا شور باپنیتے ہیں لیکن ازبکستان میں تم نقطوں والا شور پاپنیتے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ایک نقطہ والا شور باعی جب اتنا لذیز ہنا ہے تو تم نقطوں والا شور پا تو اور بھی لذیز ہو گا۔“

ہم نے ہاتھ کی روٹی بنائی تو بیرے نے ازبیک میں پوچھا ”ماں؟“

ہم نے اردو میں کہا ”ہاں ہاں بھی ماں! تم تو اردو بہت اچھی جانتے ہو۔“ اس نے سمجھا کہ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اب ہم اسے کس طرح سمجھاتے کہ ہم تو اردو کوئی نہیں کھاتے۔ البتہ ہمارے ملک میں اردو اکیدیمیاں ہیں جو اردو کو ضرور کھاری ہیں۔ پھر ہم نے ہاتھ کے اشارے سے چچ بھی لانے کو کہا تو بیرے نے ازبیک میں پوچھا ”چچ؟“

ہم نے اردو میں کہا ”ہاں ہاں چچ برخوردار تم تو اردو جانتے ہو۔ پہلے بتایا ہتنا تو ہمیں اداکاری کے امتیت جو ہر دکھانے کیوں پڑتے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے ہاں چچ پر صرف دستر خوان پر چلتا ہے یا سیاست اور حکومت کے ایوانوں میں بھی چلتا ہے؟“ بیرے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ظاہر ہے کہ چچوں کے فوائد اور نقصانات سے جتنا ہم واقف ہیں ازبکستان والے کہاں سے واقف ہوں گے۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہر اردو کھانے کا نام ازبکستان میں وہی ہے تو بیرے

سے پوچھ لیا ”میاں ایسا بتاؤ تمہارے پاس کھانے کے لئے اور کیا ہے؟“
اس پر بیکراز بیک میں کہنے لگا ”پلاو ہے، کباب ہے، قورمه ہے، قیمه ہے، مانش
کچڑی (مانش کی دال کی کچڑی) ہے۔“

یہ سن کر جی ہی میں غصہ آیا کہ ازبکستان کے لوگوں نے ہمارے امتتے اچھے اور لذیذ
کھانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

بعد میں غفور جہاں گستربی سے ازبکیوں کی اس دست درازی کا شکوہ کیا تو وہ نظر میں جھکا کر
خاموش ہو گئے۔ لیکن جب خود بخندے دماغ سے غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ تو اٹا چور کو تو ال کو
ڈائنسے والا معاملہ ہے۔ پہنچ کو ان تو ہیں ہی وسط ایشیاء کے۔ جنہیں مغل اپنے ساتھ ہندوستان لے
آئے تھے اور ان کی مدد سے آج تک ہم اپنا وزن اور بلڈ پریشر دونوں کو ہڑھا رہے ہیں۔
ازبکستان میں چار روزہ قیام کے دوران میں ہمیں ایسے کئی لفظ ملے جو اروہ اور ازبکستانی دونوں
میں مشترک ہیں۔ جیسے دستِ خوان، مہماں خانہ، آپا، خالہ، کتاب، کاغذ، قلم، دیوان، مشاعرہ،
شاعر، غزل وغیرہ۔

ایک بات اور ہم نے یہ محسوس کی کہ ازبکستان کے قول اور فعل میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے۔
”ح“ اور ”خ“ دونوں حروف جبھی کی آوازیں ان کی زبان میں راجح ہیں۔ لیکن جہاں ”ح“ کی
آواز نکالنی ہوتی ہے وہاں وہ اسے ”خ“ کے تلفظ سے او اکرتے ہیں اور جہاں ”خ“ بولنا ہوتا
ہے وہاں ”ح“ بولتے ہیں۔ ”محمر“ کو ”محمد“ بولیں گے۔ بخارا شریف کو ”بخارا شریف“،
”مہماں خانہ“ کو ”مہماں خانہ“ بولیں گے۔ ان کا ایک خوبصورت شہر ہے جسے وہ ”ہٹری بزر“
بولتے ہیں۔ ہم بھی ”ہٹری بزر“، ”ہٹری بزر“ کی گردان کرتے رہے۔ ایک دن ازبکستان کے
بارے میں ایک انگریزی کتاب مل گئی تو اس ”ہٹری بزر“ کے آگے اس کا انگریزی ترجمہ
لکھا ہوا پایا تب ہمیں پتہ چلا کہ یہ تو اصل میں ”شہر بزر“ ہے۔ ایک دن غفور جہاں
گستربی نے ہمیں بتایا کہ ہمیں تاشقند کے اور نیشنل انسٹی یونٹ بھی چنان ہے۔ ہم نے پوچھا ”یہاں

کیا ہے؟ ”بولے“ یہاں بہت قدیم مخطوطات ہیں۔ شرقیات کے بارے میں یہاں تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ بہت مشہور اوارہ ہے۔ آپ کے پہلے صدر جمہور پیدا کر راجہندر پر شاد، پہلے وزیر اعظم جوہر لال خبرد، وہرے وزیر اعظم لال پہاودر شاستری اور تیری وزیر اعظم مزرا اندر اگاندھی بھی یہاں آچکی ہیں۔ ”ہم نے کہا مخطوطات تو خیر ہمارے گھر میں بھی بہت ہیں۔ خود ہمارے کئی ناقابل اشاعت مضامین مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں مگر ہم اور بیتل انسٹی ٹیوٹ ضرور جائیں گے کیونکہ ہم کسی سے چھپے نہیں رہنا چاہتے۔“

ناشقند کا اور بیتل انسٹی ٹیوٹ عالیشان عمارت میں واقع ہے۔ ہم وہاں پہنچ تو انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر ڈاکٹر خیر اللہ منظر اپنے رفقاء کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ صاحبت عظیم جانوا بھی تھیں جو ہندوستان کے مثل حکمرانوں کے بارے میں تحقیق کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر عارفوف تھے جو جدید اردو ادب پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سوتیلانہ تھیں جو جدید ہندی اور بھی کئی محققین وہاں موجود تھے جن کے بارے میں ہم نے مزید تحقیق اس لئے نہیں کی کہ تحقیق ہمارا میدان نہیں ہے۔ ڈاکٹر خیر اللہ نے نہایت تفصیل کے ساتھ ہمیں اس انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں بتایا۔ افغانستان اور عرب ممالک کے کئی محققین یہاں تحقیق کی غرض سے آتے ہیں۔ ہندوستان کے مثل حکمرانوں پر تحقیق کے نتیجے میں وسط ایشیاء کی تاریخ کے کئی کوشے نمایاں ہوئے ہیں۔ مسودات اور مخطوطات کے نگاراں ڈاکٹر منیر دف نے ہمیں ان مخطوطات کا دیدار بھی کرایا جنہیں دیکھ کر ہماری آنکھیں وہ ہو گئیں جو اکثر ہو جاتی ہیں یعنی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نویں صدی عیسوی میں خط کوئی میں لکھا ہوا تر آن مجید کا نسخہ بھی دیکھا۔ کلیات امیر خسر و کاسب سے قدیم نسخہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔ حافظ شیرازی نے عقیدت کے طور پر حضرت امیر خسر و کے کچھ کلام کو اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔ یہ نسخہ بھی حافظ کے دستخط کے ساتھ یہاں محفوظ ہے۔ اس کا دیدار کر کے ہم نے اپنے دل کو سر اور نظر کو نور عطا کیا۔ ۶۱ تصویریں والے مصور شاہنامہ فردوسی کے بھی درشن کئے۔ البير ونی، عمر خیام، رازی، علی شیر نوائی اور کئی اہل قلم کے قلمی نسخے دیکھنے کو ملے۔

اس ادارہ میں اٹھارہ ہزار سے زائد قلمی نئے ہیں۔ قلمی نسخوں کے مگر ان ڈاکٹر منیر دف اپنے میدان کے ماہر ہیں۔ یہ ادارہ پہلے علی شیر نواحی لاہوری کا حصہ تھا۔ ۱۹۲۳ء میں سائنس اکیڈمی کے زیر انتظام اس ادارہ کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اس ادارہ میں کئی ریسرچ اسکالر اسلام کی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ ایک اسکالر سر گنے مرتبوف بھی ملے جو چین میں اسلام کے موضوع پر ان دونوں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اس ادارہ کا تفصیلی معائنوں بھی جاری ہی تھا کہ ہم نے ڈاکٹر منیر دف سے کہا کہ آپ کے ادارہ کی کتاب الرائے میں چاہئے، ہم اپنی رائے قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ غفور جہاں گستاخی بولے ”ابھی تو اور بھی کئی مخطوطات ہیں۔ جب آپ سب کچھ دیکھ لیں تو آپ کی رائے بھی بنے گی۔ قب کھ دیجئے۔“ ہم نے کہا ہماری رائے بن چکی ہے۔ یوں بھی رائے دینے کے معاملے میں اپنے ملک میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو کئی ادیبوں کی کتابوں میں شامل ہمارے مقدمے پڑھ لیجئے یا ان کتابوں کے ندیپ دیکھ لیجئے۔ آپ کے اور پیش اسٹرنیٹ کے بارے میں تو ہم کافی تفصیلی معائنوں کے بعد رائے دے رہے ہیں۔ کتابوں کے بارے میں تو انہیں پڑھ بغیر ہی رائے دے دیتے ہیں۔ اصل میں ہم تحقیق اور مخطوطات کے آدمی ہی نہیں ہیں۔ اس لئے رائے دینے کے لئے بے چین ہیں۔ ہم نے عجالت میں کتاب الرائے میں اپنی گرفتار رائے لکھی۔ ڈاکٹر خیر اللہ مظفر اور ڈاکٹر منیر دف کی درازی عمر کے لئے دعا کی اور چلے از بیک ہندوستانی دوستی انجمن میں اپنا خیر مقدم کروانے۔ اور اس خیر مقدمی تقریب میں ہمیں جانے کی جلدی اس لئے بھی تھی کہ ہمیں سورت میر تا سموف کی اردو سُنْتی تھی۔ سورت میر تا سموف ابھی ایک سال پہلے تک ہندوستان میں روی سفارت گھر میں شافتی شبہ کے مائب مہتمم تھے۔ ان دونوں تاشقند میں از بیک رہندو دوستی انجمن کے مائب صدر ہیں۔ کچھ پوچھئے تو از بکستان میں ہم اسی انجمن کے مہمان تھے۔ اردو کے بہت بڑے اسکالر ہیں۔ لکھنؤ کے لجھ والی اردو بولتے ہیں۔ بہت محبت سے ملے۔ ان دونوں تاشقند میں خواتین کی کوئی بین الاقوامی کافر فس ہو رہی تھی۔ اس کے انتظامات میں بہت مصروف تھے۔ پھر بھی وقت نکال کر ہم سے ملنے آئے۔ غفور جہاں گستاخی سے ہم نے میر تا سموف کے بارے میں پوچھا تو

بولے ”از بیک رہنڈ دوستی کی انجمن کے خیر مقدمی جلے میں ان سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔“ میر تاسوف سے ہماری یادِ اللہ دلی میں ان کے قیام کے زمانے سے ہے۔ جب بھی اردو کے مستقبل سے ما یوں ہو جاتے تھے تو ان کی اردو سننے کے لئے چلے جاتے تھے۔ اب بھلانا شقند میں ان سے کیسے نہ ملتے۔ از بیک رہنڈ دوستی انجمن کے دفتر گئے تو میر تاسوف اپنی خوبصورت اور لنشیں اردو کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ پہلے اپنے دفتر کا معاون کرایا۔ معلوم ہوا کہ دوستی انجمن کے ۱۲۰ ممالک سے تعلقات ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی رہنڈ راز بیک دوستی کا مہینہ منایا گیا تھا جس کے تحت سارے از بکستان میں ہندوستانی علمیں دکھانی گئیں۔ میر تاسوف نے بتایا کہ از بکستان میں پچاس سے زیادہ ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ خیر مقدمی تقریب میں شقند یونیورسٹی کے کئی طلباء بھی موجود تھے جو اردو سیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سارے از بکستان میں اردو کے چار اسکول ہیں اور ہر اسکول میں کم از کم چار سو طلباء اردو سیکھ رہے ہیں۔ سارے سو ویسیت پوینیں میں سہ لسانی فارمولہ راجح ہے جس کے تحت طالب علم کو پہلے تو اپنے علاوہ یاریاً سکھنی پڑتی ہے۔ وہری لازمی زبان روی ہوتی ہے۔ تیری زبان کے طور پر طالب علم کو کوئی بھی یہودی زبان سکھنی پڑتی ہے۔ اس کے تحت اکثر طالب علم اردو سیکھتے ہیں۔ اس محفل میں اردو کے کئی طبا و طالبات جیسے حسن تر دینیف، حمیو اگل پورا، مجید عبدالرحمان نوا وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ شرف مرزا انصاف بھی ملے جو شقند کے ادبی اشاعت گھر ”رادوگا“ میں اردو کے ایڈیٹر ہیں۔ بہت سلیس اور شستہ اردو بولتے ہیں۔ ریڈ یوتا شقند میں اردو کے انچارج امین جان رستموف بھی ملے جنہوں نے بعد میں ریڈ یوتا شقند کے لئے اردو میں ہمارا نشر و یو بھی لیا۔

میر تاسوف نے اپنی دل نشیں اردو میں ایک موڑ تقریب بھی کی۔ ہمیں یاد ہے کہ پہلے سال میر تاسوف جب تباولہ کے بعد دلی سے سو ویسیت یونیں والپس جا رہے تھے تو ان کی ودائی تقریب میں ہم شرکت کے لئے خاص طور پر گئے تھے تاکہ آخری بار ان کی فصیح و بلیغ اردو کو سن سکیں۔ ہمیں کیا پہنچتا کہ ایک سال بعد ہمیں شقند میں ان کی اردو کو پھر سے سننے کا موقع ملے گا۔ میر تاسوف بہت ٹوٹ کر ملے۔ آخر میں دوستی انجمن کی طرف سے ہمیں تھنچے بھی دینے گئے اور ایک از بیک

ٹوپی بھی ہمیں پہنائی گئی۔ اس چوکوشیہ از بیک ٹوپی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ سارے سر پر نہیں ساتی بلکہ سر کے سب سے اوپری حصہ پر مگری رہتی ہے۔ سارے از بیکیں اس ٹوپی کو اپنے سروں پر نکالے کھو مت رہتے ہیں۔ ہم نے بھی سر پر از بیکی ٹوپی لگائی اور علی میں دعا کی کہ زندگی میں پھر کبھی میر قاسموف کی اردو کو سننے کا موقع ملے۔



ازبکستان کے ادبیوں کے درمیان

خوشحالی، خوشحالی، خوشحالی۔ ازبکستان میں لگانار چار دنوں تک اتنی خوشحالی و تکھی کر جی اوب سا گیا۔ اتنی خوشحالی ہم سے و تکھی نہیں جاتی۔ بڑی بڑی عمارتوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں و پکھنے کو نہ ملیں تو ہمیں ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ غربت کی فراواں کوتہم نہیں خوشی برداشت کر لیتے ہیں بلکہ اس غرض سے مشرق کے وانشوروں نے قافت، صبر اور توکل پر عمل کرنے اور غربی میں نام پیدا کرنے کی اتنی تلقین کر رکھی ہے کہ خوشحالی ذرا ی ہڑھ جائے تو ہمارے کردار مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ازبکستان کی خوشحالی کو برداشت کرتے ہوئے دو ایک بارہ میں شبہ ہوا کہ ہمارے کردار کے پاؤں لا کھڑانے لگے ہیں۔ ایسے موقعوں کے لئے بزرگوں نے تزکیہ نقش کے کئی ٹوٹکے ایجاد کر رکھے ہیں۔ بلکہ ہم نے اپنے تینی پی فصلہ کر لیا تھا کہ پورے ایک دن کا برت رکھیں گے اور یہوں کا پانی پی کر گذار اکر لیں گے تاکہ ہمارے کردار کو استحکام اور استقامت عطا ہو۔ ایسی باتوں کے بغیر ہمارا کردار مضبوط ہی نہیں رہتا۔ ہم اپنے ارادے پر عمل کرنا ہی چاہتے تھے کہ ہمیں یہ مژدہ جانفرسانا یا گیا کہ ازبکستان کے ادبی اور شاعر ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے سوچا اب یہوں کا پانی پی کر گذار اکرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ ادبیوں اور شاعروں کی مخلوق ایسی ہوتی ہے جسے خوشحالی سے یوں بھی خدا اس طے کا یہر ہوتا ہے۔ اردو کے ادبی ہونے کے نتے ہمارا تو تجربہ بیہی رہا کہ بھوکے پیٹ ہم جتنا اچھا کھ لیتے ہیں اتنا ٹھکم سیری کے بعد نہیں لکھ سکتے۔ اگر کوئی شاعر صاف سحر اور قیمتی لباس پہن کر کسی مشاعرہ میں کلام سنائے تو اس کے کلام میں معنی تلاش کرنے میں ہم جیسوں کو بہت دشواری پیش آتی ہے۔ شاعر کے پھٹے پرانے، میلے کھیلے کپڑے، اس کی دگر کوں حالت اور بڑھے ہوئے بال عی اس کی شاعری میں مفہوم پیدا کرنے کی ضمانت ہوتے ہیں۔

اس دنی پس منظر کے ساتھ ہم ازبکستان کے ادبیوں کی پس ماندگی کو دیکھنے کی آس میں خوشی خوشی رائٹر یونین کے فنر گئے تو سخت مایوسی کا سامنا کراپڑا۔ رائٹر یونین کا دفتر ادبیوں اور شاعروں کا دفتر نہیں لگتا بلکہ اسٹاک اچیخ کا فنر لگتا ہے۔ نہایت عالیشان عمارت ہے۔ ایسی عمارت میں اگر وودن بھی ہمیں رہنے کا موقع ملے تو ہمارا سارا ادب خطرے میں پڑ جائے۔

رائٹر یونین کے سب صدر اسد مختار جو بیک وقت ناول نگار، شاعر اور انسانہ نگار ہیں ایک بھاری بھر کم ”السلام علیکم“ کے ساتھ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہم نے پوچھا آپ کے صدر صاحب، استقبال کے لئے کیوں نہیں آئے۔ پستہ چلا کر رائٹر یونین کے صدر عمر بیک ہماری ہی طرح ادبیوں کے کسی فند کے ساتھ کو ریا گئے ہوئے ہیں۔ اسد مختار سماں گھر کے پیٹے میں ہوں گے۔ ان کے بیک وقت ناول نگار، شاعر اور انسانہ نگار ہونے پر ہمیں اردو کے ایک ادبی پاد آگئے جو بیک وقت تمیں چار اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مشاعرہ میں ہونگ کھوتی ہے تو انسان لکھتے ہیں۔ انسان کو تاریخ میں پسند کرتے ہیں تو تنقید لکھتے ہیں۔ ان کی تنقید پر لوگ تنقید کرتے ہیں تو پھر سے مشاعرہ میں نظر آتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے ان کا حال کچھ اس طرح کا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پچانتا نہیں ہوں ابھی راہرو کو میں

ہم نے سوچا کہ اسد مختار صاحب بھی غالباً ”ضرورت اولیٰ“ کے تحت بیک وقت ناول نگار، شاعر اور انسانہ نگار بننے ہوئے ہیں۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ ازبکستان کے مشہور ادبیوں میں سے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے، ناول اور انسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بہت تپاک سے ملے۔ قبل اس کے کوہ ازبکستان کے ادبیوں کی انجمن کے بارے میں کچھ بتاتے ہم نے انہیں مختصر طور پر بتایا کہ انجمن سازی سے ہمارا بھی بہت پرانا رشتہ ہے اور یہ کہ ایک زمانہ میں ادب کم تخلیق کرتے اور ادبیوں کی انجمنیں زیادہ بناتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ ہم ادب کے ایوان میں انجمن کے راستے سے عی دا خل ہوئے ہیں۔ آج بھی دو چار انجمنیں ہماری جیب میں اور ان

کے لیئر پیڈ ہمارے بدیف کیس میں پڑے رہتے ہیں۔ کسی انجمن میں ہم صدر ہیں، کہیں نائب صدر ہیں، کہیں سرپرست ہیں اور کہیں جزل سکریٹری ہیں۔ خازن کو چھوڑ کر ہم ہر عہدہ پر بہ اجہان رہے ہیں۔ ایک بار ایک انجمن میں خازن بھی رہے۔ لیکن جب حاسدوں اور دشمنوں نے ہم پر پورے پانچ روپیوں کی خطیر رقم کے غبن کا ازام عائد کیا تو ہم انجمن سے عیینہ ہو گئے۔ بفضل تعالیٰ آج ہم اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں۔ ہم نے اسد مختار کو بتایا کہ انجمن سازی اور انجمن بانی کے اس وسیع تجربہ کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ادبیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا انتہائی دشوار ہے جتنا کہ ایک ہنسٹری میں مینڈ کوں کو پکڑنا۔ ایک کو پکڑ کر ہنسٹری میں رکھو تو دوسرا ہنسٹری سے باہر کو دجا نا ہے۔ آپ کے ادبیوں نے بھی مینڈ کوں سے ضرور کچھ نہ کچھ سیکھا ہو گا۔ اسد مختار بولے ”ہماری انجمن میں کسی کو کو دنے پھاندنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ادب تخلیق کرنے والوں کو مینڈ کوں سے کیا لیما دینا۔“ پتہ چلا کہ ازبکستان کے ادبیوں کی انجمن کے ارکان کی تعداد چھوڑ ہے جن میں سے ۲۶۰ تو خود شفند شہر میں رہتے ہیں سباقی ارکان اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضلعوں میں بھی انجمن کی شاخیں ہیں۔ انجمن کی طرف سے پانچ رسائل شائع کئے جاتے ہیں۔ ”ازبکستان ادبیات“ انجمن کا ہفتہ وار اخبار ہے جو ادبیوں کی تخلیقات شائع کرنے کے علاوہ ان کی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ انجمن کی دس کوسلیں ہیں جو اشاعت کے لئے کتابوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ سارے اشاعت گھر ریاستی ہیں جن میں ”غفور غلام اشاعت گھر“ اور ”محنت اشاعت گھر“ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ازبکستان میں سال بھر میں اوسطاً ۲۰۰ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ جن میں سے ۲۶ فی صد کتابیں دوسری جمہوریتوں کے ادبیوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ انجمن کے جلسوں میں ادبیوں کی تخلیقات پر غور و خوص کیا جانا ہے اور ادب کے نئے رسمیات پر بحث کی جاتی ہے۔ جب ادبی ۶۰ سال کا ہو جانا ہے تو حکومت اس کی ادبی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیتی ہے۔ وظیفے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ریاستی حکومت کے وظیفہ کی رقم عموماً ۲۰۰ روبل ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت کا وظیفہ ۵۰۰ روبل کا ہونا ہے۔ ضلع کے انتظامیہ کی طرف

سے دیا جانے والا لطیفہ ۴ روپیں کا ہوتا ہے۔ کویا ۶۰ سال کے بعد ازبکستان کا کوئی اویب اگر چاہے تو آرام اور سکون کی زندگی گذار سکتا ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ شاعر ۸۰ برس کا ہو گیا ہے اور مشاعرہ میں چار لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا ہے اور مشاعرہ میں کلام سنارہا ہے۔ اشمن کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اس دن رائیٹرز یونین کے جلسہ میں یوں تو بہت سے اویب تھے، محمد علی تھے جنہوں نے رامائیں کا ازبیکی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جمہ نیاز جباروف تھے جواز بکستان کے مشہور شاعر ہیں اور ادبی تراجم کے سربراہ بھی ہیں۔ مگر ہمیں سب سے نیادہ خوشی نعمت امینوف نشر سے مل کر ہوئی جواز بکستان کے طنز و مزاح نگار ہیں۔ انہیں جب پڑتے چلا کر ہم بھی طنز و مزاح نگار ہیں تو بہت ٹوٹ کر ملے۔ ہم نے نعمت امینوف سے پوچھا ”کیوں بھی نعمت صاحب! آپ کے ہاں طنز و مزاح کا کیا حال ہے؟ کیا آپ لوگ واقعی ہنستے ہیں اور اگر ہنستے ہیں تو کس طرح ہنستے ہیں اور کس پر ہنستے ہیں؟“ نعمت امینوف نے کہا ”جناب والا پتہ نہیں باہر یہ کیوں مشہور ہے کہ سودیت معاشرہ میں بھی مذاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم جتنا ہنستے ہیں، اتنا شاید کوئی بنس سکے۔ ہمارے ہاں طنز و مزاح کی روایت بہت سخیکم ہے۔ ملائیں ازبکستان کے عی رہنے والے تھے، جن کے لطیفے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ہمارے ہاں طنز و مزاح کا ایک بارہا بلہ رسالہ ”مشتم“ کے نام سے ۱۹۲۲ء سے لکھتا ہے جس کی تعداد اشاعت ۶ لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ ہر ادبی رسالہ میں طنز و مزاح کا ایک الگ کوشہ ہوتا ہے۔ نعمت امینوف نے ہمیں ”مشتم“ کے کچھ شمارے بھی دیئے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت رسالہ ہے۔ کیا چھپائی ہے۔ کیا عمدہ کارڈون ہیں۔ نعمت امینوف نے ہماری ذات میں اور ہم نے ان کی ذات میں اتنی وچھپی لی کہ اسد مختار کو یہ کہنا پڑا ”تجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دو چھڑے ہوئے بھائی متوں بعد آپس میں مل رہے ہوں۔“

نعمت امینوف نے اس دن ایک وچھپ لطیفہ بھی سنایا کہ ایک ازبیکی اپنے چھوٹے بچے کو لے کر بخارا کی سیر کرنے گیا۔ بخارا کے مشہور کلاں مینار کے قریب یہ دونوں پہنچنے تو پہنچ نے دیکھا کہ اس مینار کے سب سے اوپری حصہ پر ایک پرندے نے اپنا گھوسلہ بنارکھا ہے۔ باپ مینار کی

تاریخ بیان کرتا رہا لیکن بچہ متواتر اس پر نہ کو دیکھتا رہا۔ جب باپ نے جینار کی تاریخ بیان کر دی اور واپس جانے کا وقت آیا تو بچہ نے باپ سے کہا ”ازبکستان کے رہنے والے بھی بڑے بیوقوف ہیں، ایک معمولی سے پرندے کے رہنے کے لئے اتنا بڑا اینا تغیر کر دیا۔“

رائٹر یونین کے طبقے سے لفظ تو غور جہاں گشتوی ہمیں ازبکستان کے مشہور ادیب اور شاعر موسیٰ ایک کا میوزیم دکھانے لے گئے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھے ہیں، سو ویہت یونین میں ادیبوں اور اُن کا روں کو بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے نام اور کام کو محفوظ کرنے کے سو سو جتن کے جاتے ہیں۔ موسیٰ ایک ازبکستان کے مشہور شاعر اور ادیب گذرے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے مکان کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ اس مکان میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۶۸ء تک مقیم رہے۔ پا میر کی پہاڑیوں میں ایک چوتی بھی موسیٰ ایک کے نام سے موسم ہے۔ جدید ازبیک ادب میں موسیٰ ایک کا بہت بلند مقام ہے۔ موسیٰ ایک نے ہمیں تصانیف چھوڑیں۔ ۱۹۰۵ء میں وہ تاشقند میں پیدا ہوئے۔ کویا سو ویہت انقلاب کے وقت ان کی عمر بارہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ انقلاب سے پہلے ازبکستان میں خواندگی کا اوسط صرف دو فی صد تھا۔ موسیٰ ایک کو یہ اعز از بھی حاصل رہا ہے کہ انقلاب کے بعد وہ ازبکستان کے پہلے گرججویٹ بنے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی نظم ”موسم سرما“ کے عنوان سے کبھی۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ موسیٰ ایک نے ”تزل ازبکستان“ کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا۔ انہوں نے ازبکستان میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے ۱۹۲۱ء میں ایک مدرسہ تامّم کیا۔ موسیٰ ایک کا میوزیم اگرچہ چکا ہے لیکن اب بھی اس کے کئی شعبوں کی ترتیب کا کام جاری ہے۔ ان کی ذات سے وابستہ چیزوں کو نہایت سلیقہ سے سجا یا گیا ہے۔ موسیٰ ایک نے بحیثیت ادیب ساری دنیا کا دورہ کیا تھا۔

ہم میوزیم کے اس کمرے میں پہنچے جہاں موسیٰ ایک کی تصویریں آؤں یا ہیں تو ایک گروپ فنٹو کے سامنے اچاک رک سے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں موسیٰ ایک جب پاکستان گئے تھے تو

یہاں موقع کا گروپ نٹو ہے۔ اس تصویر میں وہ پاکستانی ادیبوں کے ہمراہ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ ہم جب بڑی دیر تک اس تصویر کے آگے رک گئے تو غور جہاں گستربی بولے ”کیا موی ایک کی یہ تصویر آپ کو بہت پسند آئی ہے؟“

ہم نے کہا ”اس تصویر کے آگے رکنے کی وجہ موی ایک نہیں کوئی اور ہے۔“

غور جہاں گستربی نے پوچھا ”کون معشوق ہے اس پر دہ زنگاری میں؟“

ہم نے کہا ”غور صاحب! معشوق نہیں بلکہ اس میں ہمارے بڑے بھائی صاحب موجود ہیں۔“

غور جہاں گستربی بولے ”آپ کے بڑے بھائی صاحب اس تصویر میں کہاں سے پہنچ گئے۔ یہ تو پاکستانی ادیبوں کے ساتھ موی ایک کا گروپ نٹو ہے۔“

ہم نے کہا ”آپ نے ابراہیم ٹلیس مرحوم کا نام نہیں بڑھا ہے؟“

غور جہاں گستربی بولے ”آپ نام سننے کی بات کرتے ہیں میں نے تو انہیں پڑھا ہے۔“

ہم نے کہا ”وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ تھیس ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہ دیکھنے والے اس تصویر میں وہ موی ایک کے ہمارے کھڑے مسکرا رہے رہیں۔ فیض احمد فیض تو ہیں ہی۔ احمد مدیم تائی، قتل شفافی، ہاجدہ مسرور بھی ہیں۔ دو چار ادیب اور بھی ہیں جنہیں ہم شلک سے نہیں پہنچاتے۔“

یہ سننے والے غور جہاں گستربی نے میوزیم کے انچارج کو بلایا اور ہمارا تعارف کرتے ہوئے کہا ”ان سے اس میوزیم کے شخصی تعلقات ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کی تصویر تو آپ کے میوزیم میں ہے۔ اب یہ خود اس میوزیم میں بفسقیں آئے ہیں۔“

میوزیم کے انچارج نے ہم سے اس گروپ نٹو میں موجود بعض ادیبوں کے بارے میں پوچھا جنہیں ہم شلک سے جانتے تھے اور ان کا نوت کرنے۔ میوزیم میں ایک کمرہ فیض احمد فیض کے لئے بھی مختص ہے۔ معلوم ہوا موی ایک سے فیض کے بہت گہرے مراسم تھے۔ فیض ایک بار ناشقہ آئے تو موی ایک کے مہمان ہوئے۔ جس کمرہ میں وہ مقیم تھے اسے جوں کا توں محفوظ رکھا

گیا ہے۔ فیض کی تصویر یہ بھی آؤیزاں میں ہم نے سوچا بھلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں فیض احمد فیض کا کوئی میوزیم نہ ہو لیکن تاشقند کے ایک میوزیم میں ان کا ایک کمرہ تو مخفی ہے۔ میوزیم کے صحن میں وہی ایک دیواریکل مجسمہ بھی نصب ہے۔

وہی ایک میوزیم سے باہر آٹھ تو ہم خوبصورت عمارت سے مغلوب تھے۔ غور جہاں گستربی بولے ”چلنے اب میں آپ کو ازبکستان کی ترقی کی نمائش میں لے چلنا ہوں۔“ ہم انہیں کیسے سمجھاتے کہ ہم خوش حالی سے جتنا دور بھاگنا چاہ رہے ہیں وہ ہمیں خوشحالی سے اتنا ہی تربیت لے جا رہے ہیں۔ راستے میں تاشقند کی کئی عظیم اشان عمارتیں اور خوبصورت مقامات نظر آئے۔ جب کوئی عالیشان اور خوبصورت عمارت نظر آتی تو غور جہاں گستربی کہتے، ”یہ عمارت ۱۹۶۶ء کے زلزلہ کی دین ہے۔“ جب دس بارہ عمارتوں کے بارے میں غور جہاں گستربی نے ہمیں یہی بات کہی تو ہم نے کہا ”ہمارے ملک میں زلزلہ کو قہر خداوند کی سمجھا جاتا ہے۔ کیا ازبکستان میں زلزلہ نعمت خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں زلزلہ سے عمارتیں گر جاتی ہیں، ازبکستان کے زلزلوں میں یہ عجیبات نظر آتی کی اس میں عمارتیں گرنے کے بجائے زمین کے اندر سے نمودار ہو جاتی ہیں۔“

غور جہاں گستربی بولے ”یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہمارے ہاں زلزلوں میں عمارتیں نہیں گرتیں عمارتیں گرتی ہیں۔ تبھی تو ہم نے نئی عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ اگر پرانی عمارتیں نہ گرتیں تو نئی عمارتیں کہاں سے آتیں۔“

۱۹۶۶ء میں زلزلہ کا پہلا تباہ کن حکمکہ آیا تھا۔ جس نے شہر کو تھس نہس کر کے رکھ دیا۔ آن کی آن میں تاشقند کے ۷۰ ہزار خاندان بے گھر ہو گئے۔ تقریباً ۱۸ میلیون تک تاشقند میں زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوتے رہے جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی زائد تھی۔ سودا بیت یونیون کے کونے کونے سے ۵۵ ہزار رضا کار ساز و سامان کے ساتھ تاشقند پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر کوئی اور خوبصورت عمارتوں کے ساتھ ازسر تعمیر کر دیا۔

غور جہاں گستربی تاشقند کی ساری خوبصورتی کو زلزلہ کی دین سمجھتے ہیں۔

دنیا کے غفور و ایک ہو جاؤ

غفور جہاں گستربی ہمارے دورہ ازبکستان میں ہمارے مترجم، میزبان، ترجمان اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کی خوشگوار صبح کو ان سے ہماری ملاقاتات ہوں گی ازبکستان کی لابی میں یوں ہوئی جیسے دیرانے میں چپکے سے بپار آجائے۔ معلوم ہوا کہ سو دیت یونیٹ کے سب سے بڑے ادبی اشاعتی مرکز ”راووگا“ میں اردو کے ایڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ تعارف کے بعد جب ہم نے ان کا نام پوچھا تو بولے ”یہیچ مدار“ اور کمترین عوام الناس میں رخصت الائیو غفور جہاں گستربی کے نام سے مشاہد پذیر ہے۔ ”خن گستربی“ سے چونکہ ہمارا پرانا تعلق ہے اس لئے جہاں گستربی کی بات تو سمجھ میں آگئی۔ لیکن رخصت الائیو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ پوچھا ”یہ رخصت الائیو کیا چیز ہے؟“

بولے ”علم و داش اور اردو زبان و ادب کا جو اور اک مبداء فیاض سے اس یہیچ مدار کو دو دیت ہوا ہے اس کی مدد سے خاکسار نے بھی اس رخصت الائیو کے سرچشمے کی تحقیق و تدقیق کرنے کی سعی و کاوش کی ہے لیکن ناکام و مادر اور ہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مشتق کیا ہے۔“

ہم نے کہا ”علم و داش اور زبان و ادب کا جو اور اک مبداء فیاض سے ہمیں عطا ہوا ہے اس کے مطابق یہ ”رخصت الائیو“ یا تو ”رخصت اللہ“ ہے یا ”رخصت الہی“ ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ازبک زبان میں رخصت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں رخصت بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔ جیسے رخصت اتفاقی اور رخصت خاص وغیرہ۔ ہمارے سرکاری ملازمین میں بہت مقبول ہے بلکہ ان کا من بھانا کھا جا ہے۔ عام فہم زبان میں اسے چھٹی کہتے ہیں۔ لیکن عام فہم زبان آپ کی تو سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیسے آپ کو سمجھائیں۔ ہماری دانست میں رخصت اللہ یا

رخصت الہی کا عام سامنہ ہم بھی ہے کہ یا تو اللہ نے آپ کو چھٹی دے رکھی ہے یا آپ نے اللہ کو۔“
بولے ”مہمان گرامی قدر! اس حقیر فقیر بندہ پر تقصیر کے نام کے اسرار و رموز کو جانے میں
آپ اپنی حیات جاوداں کی عزیز ساعتیں اور بیش بہاذہ بہانتیں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ماجز کو
صرف غنور کہئے۔ آپ کے ہاں بھی یہی عزیز ہوتی ہوگی۔“

ہم نے کہا ”غنور نہ صرف ہمارے بیہاں ہوتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔
ہمارے حیدر آباد کن میں تو غنوروں کی ایک الگ نسل بھی پائی جاتی ہے جسے ”ڈم غنور“ کہتے ہیں
اس کی توضیح و تشریع ہم نہیں کر سکے گے کیونکہ ہمیں نہ صرف آپ کی دوستی بلکہ ہند روں دوستی بہت
عزیز ہے۔ اس دنیا میں کوئی سائنٹھ غنور تو خود ہمارے دوست ہیں۔ آپ اکٹھوں غنور ہیں۔
یورپ میں پائی غنور ہیں جو ہمارے دوست ہیں۔ امریکہ میں بھی دو غنور ہمارے دوست ہیں۔
باقی کے غنورے ہندوستان میں ہیں۔ مسط الشیاء میں کوئی غنور ہمارا دوست نہیں تھا۔ اب خدا نے
آپ کو اس منصب جلیلہ پر فائز کیا ہے۔“

ہماری بات کو سن کر غنور جہاں گستردی نے خالص لکھنؤی اندراز میں سلام کرتے ہوئے کہا
”آپ کی ذرہ نوازی، غنور شناہی اور غنور پروری کا شکر یہ۔ مگر ہم اصل موضوع سے روگروانی
کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے رسمی طور پر آپ کا استقبال اور خیر مقدم کرنے کا زڑیں
اور ما در موقع عنایت کیجئے۔ آپ نے ازبکستان کی سر زمین پر قدم رنج فرمایا کہ ہماری عزت و توقیر
میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لئے میں سالم و کامل صمیم قلب کے ساتھ آپ کی خدمت اندس میں
اپنے شخصی و خصوصی اور ازبک عوام کے عموی جذبات تہنیت و تشکر تحریک پیش کرنا ہوں۔ گر قبول
افتذز ہے عز و شرف۔“

ہمارے ہندوستانی ہم سفر اشتیاق عابدی نے ولی زبان میں ہم سے پوچھا ”مجتنی بھائی! یہ
غنور صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟“

ہم نے کہا ”بروی تکلیف کے ساتھ کتابی اردو میں ہمارا شکر یہ او اکر رہے ہیں۔“

اس کے بعد یہ معمول سامن گیا کہ اگر ازبکی زبان میں کوئی ہم سے بات کرتا تو غنور جہاں گستربی "طلسم ہو شر با" والی اردو میں اس کا ترجمہ ہمارے لئے کرتے اور بعد میں ہم غنور جہاں گستربی کی اردو کا ترجمہ خود اپنی اردو میں اشتقاق عابدی کے لئے کرتے۔ پہنچ نہیں غنور جہاں گستربی نے یہ اردو کہاں سے سمجھی اور کیسے سمجھی۔ اردو کے ایسے مشکل، ثقل اور متروک الفاظ جنہیں تیس چالیس میں ہم نے نہ کہیں سنانہ پڑھانے لکھا انہیں غنور جہاں گستربی کی وساطت سے ازبکستان میں سننے اور برستے کا موقع ملا۔ ان سے مل کر نہ صرف اردو کا مستقبل رونٹ نظر آیا بلکہ اس کا ماضی تو اتنا رونٹ نظر آیا کہ ہماری بصارت اور بصیرت دونوں چکا چوند ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف فیضِ احمد فیض سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ ان سے گھنٹوں اپنی مخصوص اردو میں تبادلہ خیال بھی کیا ہے۔ ہم نے کہا کہ "ہمیں پتہ ہے کہ آپ فیضِ احمد فیض سے مل چکے ہیں۔"

گھرے تجسس کے ساتھ پوچھا "آپ پر یہ حقیقت کیسے مٹا شف ہوئی کہ خاکسار فیضِ احمد فیض کی دلوں از صحبت خاص سے مستفیض و فیضیاب ہو چکا ہے۔ ہم نے کہا کہ "فیض کی شاعری پر آپ کی اردو کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ آخری عمر میں بڑی مشکل شاعری کرنے لگے تھے۔ آپ سے نہ ملتے تو ان کی شاعری میں یہ سوژ کہاں سے آتا۔"

نظریں جھکا کر اور قد رے شرم اکر بولے "آپ کی غنور نوازی کا شکر یہ۔" چاروں ازبکستان میں ان کے اور ان کی اردو کے ساتھ ایسے گزرے کہ ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ پہلے دن ٹاشقند کی سیر کر کر اس کے رات کو وہ اپنے گھر چلے گئے تو اشتقاق عابدی نے ہم سے کہا "اب آپ اپنے بستر استراحت کو اپنے قدم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں تا کہ نیند آپ کو اپنی پر سکون آغوش میں سمو لے اور آپ اس جہاں قائمی کے آلام و مصائب نیز افکار و حوادث سے عرصہ مختصر کے لئے ہی سہی رستگاری حاصل کر سکیں۔"

ہم نے بس کہا "فیض کی شاعری کے بعد اب آپ کی نشر بھی غنور جہاں گستربی کی اردو سے متاثر ہونے لگی ہے۔ عابدی صاحب ایج تو یہ ہے کہ غنور جہاں گستربی سے مل کر ہمیں بے ساختہ

بیل کی والدہ یا و آرہی ہے۔“

اشتیاق عابدی نے حیرت سے پوچھا ”بیل کی والدہ ایک کیا قسم ہے؟“

ہم نے کہا ”یہ قسم میں بائیکس برس پرنا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تلگو کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کے لئے ایک تلگو ادیب کا انتخاب کیا گیا جو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ جب ترجمہ ہو گیا تو یہ ترجمہ نظر ثانی کے لئے ہمارے پاس آیا۔ نہایت فضیح و بلیغ ترجمہ تھا۔ ایک الیہ انسانہ تھا جس میں ایک غریب کسان کی زندگی کو پیش کیا گیا تھا اس کہانی میں کسان کا نوجوان بیل مر جاتا ہے۔ منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ نوجوان بیل مر چکا ہے۔ ایک طرف بیل کی لعش پڑی ہے۔ دوسری طرف کسان اوس بیٹھا ہے اور تیری طرف وہ گائے بھی اوس کھڑی ہے جس نے اس بیل کو جنم دیا تھا۔ انسانے کا یہ موز نہایت متاثر کن تھا۔ لیکن مترجم نے نصاحت و بلافت کے دریا بہارتے ہوئے اس منظر کو اپنی عالمانہ اردو میں یوں بیان کیا تھا ”ایک طرف تو نوجوان اور تو خیز بیل کی لعش ہے کور و کفن پڑی تھی، دوسری طرف بیل کی والدہ کھڑی آنسو بہاری تھی۔“ دوسرے دن مترجم موصوف ترجمہ کے بارے میں ہماری رائے جانے کے لئے آئے تو ہم نے کہا ”ترجمہ تو نہایت فضیح و بلیغ ہے۔ ہمیں پسند آیا۔ لیکن ایک انسانہ میں بیل کی والدہ کا ذکر ہے۔ اس طرز تھا طب پر ذرا نظر ثانی کر لیں تو مناسب ہے۔“

تیرے دن وہ ترجمہ پر نظر ثانی کر کے ہمارے پاس آئے۔ ہم نے بیل کی والدہ والا صفحہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب کی بارفاضل مترجم نے ”بیل کی والدہ“ کو کاٹ کر ”بیل کی والدہ محترمہ و معظمه“ بنادیا تھا۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ مفترضہ تھا بات غنور جہاں گسترشی کی ہو رہی تھی۔ جتنی مشکل اردو وہ بولتے تھے اتنے ہی سادہ انسان وہ ہمیں نظر آئے۔ جیسا کہ عام طور پر سارے غنور ہوتے ہیں۔ نہایت مقصوم، مخلص، مختنی اور شریف۔ تاشقند جا کر ہی ہمیں یہ پتہ چلا کہ غنور چاہے ہندوستان میں رہیں

یا یورپ میں یا وسط ایشیاء میں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو ہم مذاق میں انہیں
یہ دنیا فرہادے آئے ہیں کہ ”دنیا کے غنور و ایک ہو جاؤ۔“

ان کی پابندی وقت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ صحیح آٹھ بجے آنے کے لئے کہہ جاتے تھے تو ٹھیک
سات بج کر انسٹھ منٹ پر دروازے پر ان کی دستک سنائی دیتی تھی۔ چونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم
اویب ہیں اسی لئے ایسی جگہوں پر ملے جاتے تھے جو ادیبوں کی وجہ پر کا سبب نہیں۔

پہلے دن یعنی چوک کی سیر کر اچکے تو کہنے لگے ”اب میں آپ کو باعث شعراء لے چلا ہوں جو
علیٰ شیرنوں تحریر کے آگے واقع ہے۔“ ہم نے کہا ”غنور صاحب! ماں کہ ہم اویب ہیں لیکن
شاعروں سے نہ صرف گھبرا تے ہیں بلکہ حتیٰ لامکان بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سو وہیت یونین کا
دورہ بھی اس لئے کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لئے یعنی سہی اردو کے شاعروں سے ہماری جان
چھوٹی اور ہم نکر ارشاد اور سبحان اللہ، کہنے سے بچ رہیں۔ آپ تو یہاں بھی ہمیں باعث شعراء
میں ملے جا رہے ہیں۔ کہیں کسی شاعر نے ہمیں کلام سنایا تو؟ اور اگر اس کا کوئی شعر غلطی سے سمجھے
میں آگیا تو؟“

غنور جہاں گستاخی بولے ”آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ میں آپ کو ان مردہ شاعروں کے پاس
لے جا رہا ہوں جو امر ہو چکے ہیں۔“ ہم نے کہا ”کیا مطلب؟“

بولے ”باعث شعراء میں ہم کو زندہ شاعر نہیں ملیں گے۔ اس باعث میں تو ازبکستان کے سارے
عظیم المرتبہ شاعروں کے مجسمے آپ کو دیکھنے کو ملیں گے۔“

ہم نے کہا ”کیا آپ کے ہاں بھی پانی کی اتنی ہی تلت ہوتی ہے کہ حکومت ہم جیسے ادیبوں
اور فنکاروں کے مجسمے نصب کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔“

بولے ”ازبکستان میں پانی اتنا ہی اب ہوا کرتا تھا کہ ہمارے لوک ادب میں پانی کے ایک
نظر و کھوٹی کے ایک دانہ سے زیادہ قیمتی بتایا جاتا تھا۔ لیکن مجتنی صاحب! ہماری سمجھہ میں ایک بات
نہیں آتی۔ پانی کی تلت سے ادیبوں کے ٹسٹوں کا کیا تعلق ہے؟“

ہم نے کہا ”بہت سمجھ راتعلق ہے۔ ہمارے ہاں جب بھی پانی کی قلت ہو جاتی ہے تو حکومت عوام کی پیاس بجا نے اور ان کا کنجیدہ بخندنا کرنے کے لئے اوپوں اور فکاروں کے مجسمے کھڑا کر دیتی ہے چنانچہ ہندوستان میں ہمارا تعلق جس ریاست سے ہے وہاں لوگ بوند بوند پانی کے لئے ترس رہے ہیں اور حکومت عوام پر فکاروں کے مجسموں کے بارش بر ساری ہے۔ ہماری ریاستی حکومت کا خیال ہے کہ جب سارے فکاروں کے مجسمے نصب ہو جائیں گے تو ان حساس فکاروں کے مجسموں کی آنکھوں سے عوام کی بے بسی اور مجبوری پر اتنے آنسو پہنچ لگیں گے کہ ساری ریاست میں سیاہ آجائے گا۔“

غفور جہاں گستربی کی کچھ بجھ میں نہیں آیا۔ آسان بات یوں بھی ان کی بجھ میں نہیں آتی تھی۔ بولے ”ہماری حکومت عوام کا کنجیدہ اس طرح بخندنا نہیں کرتی۔ خیر میں آپ کے ملک کے اندر ورنی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی ریاستی سرکاری تحریک ہی کر رہی ہو۔“

خیر تھوڑی دیر بعد ہم باش شعرا میں تھے۔ ایسی خوبصورت اور پر نضا جگہ ہے کہ ہم جیسے شاعر دشمن کا جی بھی شعر کوئی کی طرف مائل ہونے لگا۔ شاعروں کے کیسے باوقار اور پر شکوہ مجسمے ہیں۔ علی شیرنولی، لطفی، نادرہ، مولانا مقتبی، ظہیر الدین فرقہ، حکیم زادہ نیازی، عبداللہ قادری، حمید عالم جان، غفور غلام اور موسیٰ ایک لپنے لپنے ڈھنگ سے کھڑے ہیں پاس ہی ایک کوشے میں بڑی سی پگڑی باندھے ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ ہم نے پوچھا ”آپ کی تعریف؟“

غفور جہاں گستربی بولے ”یہ بابور ہے بابور از بکستان کا مشہور دانشور اور شاعر اس کے نام پر نامہ“ کا ذکر تو آپ نے سنا ہوگا۔“

یہ سنتے ہی ہمارا سر تغظیما جھک گیا اور ہم نے غفور جہاں گستربی سے کہا ”غفور صاحب اختر دار، بہ ادب بہ ملاحظہ ہو شیار۔ آپ جس بابور کا ذکر یوں سرسری طور پر کر رہے ہیں وہ ہمارے سلطان ابن سلطان، خاتمان ابن خاتمان، بانی، سلطنت مغلیہ، گیتی پناہ، شہنشاہ ہندوستان، علی سجانی، اعلیٰ حضرت ظہیر الدین محمد بابر ہیں۔ کم از کم ان کا نام تو احترام سے لجئے۔ یہ ہمارے

حکمران رہ چکے ہیں۔"

غفور جہاں گستربولے "ہوں گے آپ کے حکمران۔ مگر یہاں تو با بور دلوں پر حکمرانی کرنا چے۔ اس کے شعر کا سکھ چلتا ہے اور اس کے علم کا ذائقاً بجاتا ہے۔"

سو ویت یونین میں اویوں اور فنکاروں کی جو عزت ہے اسے دیکھ کر ہم کچھ اور بھی احساس کرتی میں جتنا ہو گئے۔ شاہراہیں ان کام سے ہیں، پہاڑوں کی چوٹیاں فنکاروں کے ہاموں سے منسوب ہیں تاشقند کے کئی اسٹیشنوں کے نام بھی شاعروں ہی کام پر رکھے گئے ہیں ہم نے غفور جہاں گستربولے پوچھا "انتہے دیوبیکل اور بھاری محسموں کی تیاری پر کتنا خرچ آتا ہوگا۔" بولے "ایک ایک مجسم پر کئی کئی ہزار روپی خرچ آتا ہے؟" ہم نے کہا "اگر آپ ازراہ ادب نوازی ہمیں بھی روزانہ صرف دس روپی دیا کریں تو ہم خود بے نقش نہیں بطور مجسم آپ کے باغ شعرا میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔ اتنا ستا مجسم آپ کو نہیں ملے گا۔"

ہمیں غفور جہاں گستربولے اس وقت غصہ آیا جب انہوں نے ہماری پیشکش کو نہیں کرنا لیا۔ بولے "پنے ملک میں پانی کی قلت کی دعا کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دن خود آپ کے شہر میں آپ کا مجسم کھڑا ہو جائے۔" اور ہم نے بات کو کاٹ کر کہا "جس پر تھکے ماندے پرندے بیٹھ کر بید کرتے رہیں گے۔"

ازبکستان میں پہلے ہی دن سے وہ ہماری صحت کے بارے میں ضروری اور غیر ضروری پذیریں دیا کرتے تھے۔ ہمیں چھینک بھی آجائی تو ان کا دل دھڑ کنے لگتا تھا۔ کہتے تھے آپ کو ازبکستان سے ما سکو اور لیسن گراؤ بھی جانا ہے۔ ما سکو پہنچنے تک آپ کی صحت کٹھیک رکھنے کی ذمہ داری میری ہے۔ اسی لئے اپنی صحت کی حفاظت کیجئے۔ بخارا کی سیر سے ہم دوبارہ تاشقند واپس آنے لگے تو اچاک بخارا کا موسم بے حد سرد ہو گیا۔ لوگوں کا زیان تھا کہ پچھلے پچاس میں میں ایسا موسم دیکھنے کو نہیں ملا۔

ہم رات کو چھوٹے سے طیارہ کے ذریعہ بخارا سے تاشقند آئے۔ پون گھنٹے کی پرواں میں وہ

بار بار ہمارا حال پوچھتے رہے کہ بخارا کے موسم کی وجہ سے کہیں آپ کو بخارا تو نہیں آ رہا ہے۔ آنکھوں میں کہیں جلن تو نہیں ہو رہی ہے۔ اشتیاق عابدی نے طیارہ میں کھاننا شروع کیا تو بیچھیں سے ہونے لگے۔ رات کو ہمیں ہوکل پر چھوڑ کر جانے لگئے تو بولے ”بخارا کے سرد اور غیر متوقع موسم کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یہاں سے اختیار میں نہیں تھا کہ بخارا کو اس موسم سے اور اس موسم کو آپ سے بچانا۔ کل ناشقند میں آپ کا بے حد صرف آخری دن ہے۔ کئی جلسوں میں آپ کو شرکت کرنی ہے اور خطاب بھی کرنا ہے۔ اپنی صحت کو ٹھیک رکھنے اور ہو سکنے تو اپنی اپنی تقریروں کی تیاری بھی کر لیجئے۔ میں صحیح آٹھ بجے کمرے پر آ جاؤں گا۔“

البادار اشتیاق عابدی کو اور ہمیں ایک بڑے ذہل بیڈ والے کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہم حسب عادت گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ صحیح پائیج بجے ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اشتیاق عابدی اپنے بستر میں پڑے ہندروں دوستی کے موضوع پر بہ آواز بلند تقریر کر رہے ہیں۔ ہم بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں۔ بڑی آہنگی کے ساتھ میز پر سے قلم کاغذ اٹھایا اور لگئے ان کی تقریر کے اہم نکات نوٹ کرنے۔ اشتیاق عابدی کہہ چلے جا رہتے تھے:

”ہندروں دوستی کے بغیر عالمی امن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رہن کی دوستی وقت کی کسوٹی پر پکھی ہوئی دوستی ہے۔ سو وہیت یونین نے کب کب اور کہاں کہا اور کیسے کیے کئھن وقت میں ہماری مدد کی ہے۔ میری قماں! میری قماں! (کراپنے کی آواز)“ تقریر تو ان کی بہت مدلل اور اڑ انگیز تھی مگر یہ درمیان میں ”میری قماں! میری قماں“ کی تکرار سے ہمیں تشویشی ہوئی۔ دبے پاؤں ان کے قریب جا کر ان کی پیٹھانی پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے ہم نے جلتے ہوئے تو ہر پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہم نے انہیں جگانے کی کوشش کی تو ایک عجیب سی بحرانی کیفیت میں پوچھا ”کون ہے؟“

ہم نے کہا ”آپ کا دوست ہوں مجتنی۔“

کروٹ بدلتے ہوئے بولے ”کوئی مجتنی میرا دوست نہیں ہے۔ سو وہیت یونین ہی میرا واحد

دوست ہے۔ مجھے سودیت یوئین کی دوستی پر فخر ہے، میری اتنا امیری تھا۔“

ہم نے نازلیا کہ معاملہ ٹکنیکیں ہو گیا ہے۔ دیار غیر میں کس سے مدد طلب کریں بھی تو کس زبان میں۔ ہم جس زبان میں اپنا معاشرایا مرض کی کیفیتیں بیان کرتے ہیں اس کو جانشہ والے تو غور جہاں گستاخی ہی ہیں جو ذہانی گھنٹوں بعد آئیں گے۔ ہندوستان سے ہم مختلف انواع امراض کی جو دو ائمیں اپنے ساتھ لے چکے تھے وہ اشتیاق عابدی کو دیں۔ مگر ان کی ہندو روں دوستی میں کوئی افاقت نہ ہوا بلکہ آخر میں تو امریکا کو کھلم کھلا گالیاں تک دینے لگے۔ ٹھیک سات نج کرانٹھ منٹ پر غور جہاں گستاخی آئے تو ہم نے انہیں سارا ماجدہ کہہ سنایا۔ یہ سنتے ہی غور جہاں گستاخی پسینہ میں شر بور ہو گئے۔ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ ہم نے انہیں تھام لیا اور کہا ”ہمارے بیہاں آواب تھارداری ایسے نہیں ہوتے۔ تھاردار کو کھور دل کا ہوا چاہئے۔“ غور جہاں گستاخی نے ہماری کوئی بات نہیں سنی اور اچاک کرہ سے چلے گئے۔ پانچ ہی منٹ بعد وہ دو عدد لیڈی ڈاکٹروں، تین عدد دزسوں اور ایک اسٹریچر کے ساتھ خوددار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے اشتیاق عابدی کا معاشرہ شروع کر دیا تو خود پسینہ پوچھتے ہوئے بولے ”میں نے سارے انتظامات کر لئے ہیں۔ یعنی ایم بولینس گاڑی بھی کھڑی ہے۔“

ہم نے کہا ”اور اس کے بعد کے انتظامات کے بارے میں بھی کہہ دیا ہوگا۔“

انہوں نے ہماری بات سنی ان سنبھالی۔ انہیں ہماری بات کو سننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ اشتیاق عابدی کے ناکر تے لیڈی ڈاکٹروں نے ان کے دونوں ٹوپیوں پر دو نجکشن داغ دیئے اور کہا ”دو گھنٹوں کے اندر اگر انہیں پسینہ آگیا تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ پروگرام کے مطابق دس بجے اوارہ شرقيات میں ہمارا خیر مقدم تھا۔ زس کو اشتیاق عابدی کے پاس چھوڑ کر ہم اکیلے ہی سونے مقلل چلے۔ اشتیاق عابدی سے کہا ”آپ فکر نہ کریں ہم سنچال لیں گے۔ ہندوستان کی طرف سے اچھی ہی تقریب بھی کر دیں گے۔ رات کو آپ کی تقریب تو ہم نے سن ہی لی ہے۔ اس میں سے میری اتنا امیری تھا، کونکال کرباقی تقریب کر دیں گے۔“

دو گھنٹے بعد ہم واپس آئے تو اشتیاق عابدی بدستور تقریر کے جا رہے تھے اور پسینہ کا دور دور نکل پڑتا رہا۔ اب غنور جہاں گستاخی کی پریشانی بے تابو ہو گئی اور وہ پسینہ میں شر اپر ہونے لگے۔ دشمن میں بولے ”شومنی قسمت سے یہ بہت براہور ہا ہے۔ ہم نا شفند میں ہندوستانی مہماںوں کے تعلق سے بہت فکر مندر رہتے ہیں۔ اگر عابدی صاحب کو فوراً پسینہ نہ آیا تو ہم انہیں ماسکونیں جانے دیں گے۔ یہیں سے اسپتال میں داخل کر دیں گے۔ آپ ما سکو چلے جائیں۔ یوں بھی ان کا نا شفند سے ہندوستان واپس جانا زیادہ آسان ہے بنیت ان کے ما سکو سے ہندوستان جانے کے۔“

یہ سنتے ہی اشتیاق عابدی رضاۓ پھینک کر کھڑے ہوئے اور ان کے جسم سے پسینہ کا دھنیلاپ لدا کر اسی سے غسل صحت فرمائے گئے۔ موصیت میں لپی ہوئی غنور جہاں گستاخی کی وجہ بات کا یہ ادنیٰ سا کر شدہ تھا۔ اشتیاق عابدی کو پسینہ میں شر اپر دیکھ کر غنور جہاں گستاخی کے چہرے پر سکون اور صبرت کے وہ آثار دکھائی دیئے جو عموماً ایک پچھکو ختم دینے کے بعد ماں کے چہرے پر دکھائی دیتے ہیں۔



جده میں جشن طنز و مزاج

ایک خطبہ صدارت

سب سے پہلے تو میں "بزم اردو جدہ" کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی عنایت سے آج اس محفل میں مجھے خواہ بخوبی کسی معموق شخص کو نہایت احترام کے ساتھ "جناب صدر، جناب صدر" کہہ کر مخاطب نہیں کہا پڑ رہا ہے کیونکہ اتفاق سے یہا معموق شخص میں خود ہوں۔ جو لوگ کہنے اور ہونے کے نازک فرق کو جانتے ہیں وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ جب تک کسی شے کے ہونے کی بشارت نہیں جائے تب تک وہ نہیں ہو سکتی۔

ڈیویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہونا میں تو کیا ہونا

کارکنان بزم اردو جدہ کی یہ جدت نہیں تو اور کیا ہے کہ انہوں نے مجھناچیز کو بیک وقت تین مغلوں کا اکلوٹا صدر مقرر کر دیا ہے یعنی اوپی اجاس، مغل لطیفہ کوئی اور مغل غزل کا مشترک صدر۔ ناہم صدارت کے معاملے میں عہد یہ اران بزم اردو جدہ کی اس فراخ دلی کے باوجود مجھے ان سے کوتاہ دلی کی شکایت ہے۔ کوتاہ دلی ان معنوں میں کشراع میں بیک وقت چار صدارتوں کا بھی مستحق ہو سکتا تھا۔ بھلے یہ متخل نہ ہو سکوں۔ شرع کے معاملے میں ہم بہت سی باتوں کے متخل نہیں ہوتے لیکن مستحق ہونے کا دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں۔

پہنچ نہیں منتظمین کو کیا سمجھی کہ انہوں نے مجھے بیک وقت تین مغلوں کا صدر بنادیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ ہمارے ملک میں مشرق و سطی کے کسی ملک سے جب بھی کوئی آتا ہے تو اس

کے ہاتھوں میں ”ٹوان ون“، ”تھری ان ون“ کو ضرور تلاش کرتے ہیں۔ میں بھی شاید ”تھری ان ون“ نام کا صدر ہوں۔ ایک ایسا ہمہ متعددی اور ہم جتنی صدر جس کی صدارت کے آخری دور میں صدارت کی سُنگت طبلہ اور ہار موئیم پر بھی کی جائے گی۔ وطنِ ماں وف میں ہم تو یہ سنتے آئے ہیں کہ سعودی عرب و فرمائ ومتاع اور اشیاء کی افراط و تغیریط کیلئے مشہور ہے۔ جہاں پانی کی ایک بوند و رکار ہو وہاں وریا بھی بہاؤ نے جاتے ہیں لیکن صدور کے معاملے میں اس تکت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ماشاء اللہ اپنے وطن میں تو صدور کی اتنی بہتان ہوتی ہے کہ ایک ایک محفل کی صدارت کے لئے وہ صدر آس لگائے کھڑے رہتے ہیں۔ صدور کی اسی کثرت کا نتیجہ ہے کہ کئے کے پھر مارنے جاؤ تو وہ صدر کے لگ جاتا ہے۔ بعض جلیل القدر صدر تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو جلوں کی صدارت کرنے کی آس میں جلسہ کے آغاز سے پہلے لوگوں سے نظریں بچا کر جلسہ گاہ میں جھاڑوں گانے اور جلسہ کے اختتام کے بعد بوریاں اور کرسیاں تک اٹھانے کیلئے آمادہ رہتے ہیں۔ اس پر مسٹر افتظیں کو پیش بہا عطیات سے بھی نوازتے ہیں۔ فراغی کے اس ماحول میں آپ نے مجھ کمترین کو صدق دل کے ساتھ تمیں محفلوں کا اکلونا صدر بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ بعض صورتوں میں واڑھی سے موچھیں بھی بڑی ہو سکتی ہیں۔

حضرات! میں یہ عرض کرنا چلوں کے اپنے وطن میں، میں نے جلوں کی صدارت سے اس دن سے توبہ کر لی ہے جب ایک جلسہ کے صدر کی حیثیت سے میں نے منتظمین کو تاکید کی تھی کہ وہ صدر جلسہ کو دن ہار پہنانا میں حتیٰ کہ منتظمین کو ہاروں کی رائج وقت قیمت کے مطابق پیشگی رقم تک دے دی تھی۔ لیکن فسوس کہ منتظمین جلسہ کو ایک ہار تک پہنانے کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ اس دن میری گردن ہاروں کے بوجھ سے نہیں بلکہ شرم سے جھک گئی اور اب تک جھکی ہوئی ہے۔ ملکی منتظمین جلسہ پر سے میرا اعتماد اب اٹھ سا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض جلوں کے منتظمین نے بعد میں میرا اعتماد پھر سے بحال کرنے کی خاطر یہ انمول تجویز بھی پیش کی کہ میں انہیں ہاروں کی پیشگی رقم دینے کے بجائے رقم کی اوائیگی کا یہ اصول مقرر کروں کہ اوہرہ اس پر ایک ہار میری گردن میں پڑے اور میں ہار پہنانے والے کو مصانعہ کرنے کے بہانے چکپے سے اس کے ہاتھ

میں ہار کی قیمت رکھتا پلا جاؤ۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ساتھ دے اس ساتھ لے

اب آپ سے کیا چھپا کر اس تجویز پر بھی عمل کر کے دیکھ لیا۔ جلسہ کی صدارت تو نہ ہو سکی البتہ پہلے ہی ہار کی قیمت کے مسئلہ پر بھرے مجمع کے سامنے ہم میں اور منتظرین میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بھاؤ تاؤ کرنے کی بہت کوشش کی۔ سودا طنہیں پاس کا تو ہم دور و پیٹ کا ایک ہار دس روپیے میں پہن کر غصہ میں ڈاکس سے اتر آئے۔

حضرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مر جھا گئے

ہم سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن گھانے کا سودا نہیں کر سکتے۔

حضرات! ہم صدر جلسہ کے فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ صدر جلسہ کا ایک فرض تو یہ ہوا ہے کہ وہ جلسہ کی کارروائی اور اس کے انعقاد کی غرض وغایہت کو جانے بغیر گھنٹوں کری صدر اس پر بیٹھ سکے۔ ایک منزل تزوہ بھی آتی ہے جب یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ صدر کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کسی صدارت کہاں پر ختم ہو رہی ہے۔ صدر اور کسی صدارت دونوں یک جان و دطالب بن جاتے ہیں۔ میں اس وقت اس مصوم بیچے کی یاد آرہی ہے جو اپنے باپ کے ساتھ ایک جلسہ میں شرکت کیلئے گیا تھا۔ اس نے لگانا کئی گھنٹوں تک کری صدارت پر بیٹھے ہوئے جامد و ساکت صدر جلسہ کو بغور دیکھنے کے بعد اپنے باپ سے بصر اشتیاق پوچھا تھا ”ڈیڈی! کیا صدر جلسہ کی چھٹا نگیں ہوتی ہیں؟“

اس پر باپ نے اس مصوم کی غلط فتحی کو دور کرنے کے لئے سمجھایا تھا ”نہیں بیٹا! ان چھٹا نگوں میں سے دونا نگیں صدر جلسہ کی ہیں اور باقی چار نا نگیں کری صدارت کی ہیں۔ جب جلسہ ختم ہو گا تو تم دیکھو گے کہ دونا نگیں تو صدر جلسہ کے ساتھ چلی جائیں گی اور باقی مادہ نا نگیں کری صدارت میں ہیں گلی رہیں گی۔ صدر چاہے کتنا ہی معدود اور مقلوب کیوں نہ ہو چل سکتا ہے لیکن کری صدارت نہیں چل سکتی۔“

حضرات! آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ صدر محفل چاہے کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہوا سے اپنے خطبہ صدارت میں دو چار ایسی سنجیدہ باتیں ضرور کہنی پڑتی ہیں جن پر کوئی عمل نہ کر سکے۔ اس رعایت سے مجھے بھی کچھ سنجیدہ باتوں کے کہنے کا حق حاصل ہے۔ بزم اردو وحدہ کی سرگرمیوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ دیار غیر میں رہتے ہوئے آپ اردو کے لئے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اصول نہیں کرنا چاہئے۔ حق تو یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لئے استطاعت اور توفیق دونوں نہایت ضروری ہیں اور اپنے ملک میں یہ حال ہے کہ جس کے پاس استطاعت ہے اسے توفیق نہیں عطا ہوتی اور جسے توفیق عطا ہوتی ہے اس کے پاس استطاعت نہیں ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ استطاعت اور توفیق دونوں کی دولت سے مالا مال ہیں۔ بزم اردو وحدہ نے بر صیر بندو پاک کے لفڑی مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک نیک کام انجام دیا ہے جو اس کے کئی نیک کاموں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ انفل بھی ہے۔ بزم اردو وحدہ نے پچھلے ہفتہ جو مزاحیہ مشاعرہ برپا کیا تھا ویسا مشاعرہ میں نے اپنی تمیں سالہ ادبی زندگی میں نہ کبھی دیکھا اور نہ سن۔ بر صیر کے سارے بڑے اور اہم شاعر اس مزاحیہ مشاعرہ میں جمع تھے۔ شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے مینڈ کوں کو ایک پسیری میں پکڑنا۔ یہ سارے شاعر اگر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مینڈ کوں نے اب اپنی نظرت بدل لی ہے بلکہ سارا کمال بزم اردو وحدہ کی پسیری کا ہے جس کے دامن میں ہر کوئی کھنچا چاہا آتا ہے۔

اردو کے ایک اولیٰ مزاح نگار کی حیثیت سے یہ مرارا بخ عقیدہ ہے کہ جب تک ہر انسان کو اس کے حصے کی چیز خوشیاں اور مسرتیں نہیں مل جاتیں تب تک اس دھرتی پر داغی امن ناگم نہیں ہو سکتا قدم وحشی انسان کے قہقہے سے لے کر آج کے انسان کے قہقہے تک تہذیب نے ایک لمبا سفر طئے کیا ہے۔ لیکن جدید معاشرہ کے تضادات اور کشمکش نے مہذب انسان کے قہقہے کے اصلی روپ کو بد لنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں جہاں رہنا چاہئے وہاں بُس دیتے ہیں اور جہاں ہنسنا چاہئے وہاں رو دیتے ہیں۔ اہمیت صرف فہمی کی نہیں ہے بلکہ اس بات کی ہے کہ کب ہنسا جائے، کیسے بنا جائے، کتنا بنسا جائے اور کس پر بنسا جائے۔ ہمارا معاشرہ دون بدن کچھ اتنا تیز رفتار اور عصیدہ ہونا جا رہا

ہے کہ ہم زندگی کی خوشگواریوں، فانتوں اور زادتوں کفر اموش کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پرسوں میں نے ایک دوست کو ایک لطیفہ سنایا تو اس نے لطیفہ پر ہنسنے کی بجائے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا ”یار! اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ تمہارے لطیفے کے ساتھ انساف نہیں کر سکوں گا۔ اگر تم اجازت دتوں میں اس لطیفہ پر گھر جا کر ذرا طمیان تلب کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کروں گا۔“

حضرات امیرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک سچے، مہذب اور مخلص انسان کے قیمتیہ کی بازیافت نہیں ہو جاتی تب تک یہی ہونا رہے گا۔ اس سلسلے میں مزاح نگار بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ظرافت نگاری کے لئے آدمی ظریف ہواعی کالی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہوں بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ظریف مزاح کی یہ محفل اس ارض مقدس پر منعقد ہو رہی ہے جہاں چودہ سورس پہلے ساری انسانیت ایک نئی تہذیب اور ایک نئی روشنی سے روشناس ہوئی تھی۔ اس روشنی نے انسانیت کو جینے کا ایک نیا سلیقہ اور نیا آہنگ عطا کیا تھا۔ تہذیب ہی انسان کو ہنسنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کائنات میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جسے خدا تہذیب کی دولت عطا کی ہے۔ فرشتے تک اس بیش بپا دولت سے محروم ہیں۔ اس بات سے بھی ہنسی کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

سب سے آخر میں بزم اردو کے کارکنان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے ویلے سے مجھے اس ارض مقدس پر حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر امیر، صدر بزم اردو جدہ کے نام اور کام سے میں بہت پہلے سے واقف تھا تاہم ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی سرگرمیوں کے حساب سے میں تو انہیں اوب اور فلسفے وغیرہ کا ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ یہاں آکر پڑتے چلا کر بچ بیکاریوں اور دوائیوں والے ڈاکٹر ہیں۔ بچ تو یہ ہے کہ جو ڈاکٹر اردو زبان میں اور اس زبان کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرتا ہے اس کے پاس نہ جانے کیوں بار بار جانے کو جی چاہتا ہے چاہے آپ صحت مند ہی کیوں نہ ہوں۔ اب آپ سے کیا چھپا کر وطن والوف میں ہمارے ایک دوست ہیں۔ ڈاکٹر رام پرشاو، خالص اور بھیث اردو علاج کرتے ہیں۔ جب یہاپنے میٹھے

لیجے کے ساتھ خالص اردو میں پرپش احوال کرتے ہیں تو ساری بیماریوں کے آثار بدن سے بکھر غائب ہو جاتے ہیں۔ بارہا مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا بلڈ پریشر کانی ہڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر رام پرشاد کے پاس جانا ہوں اور وہ اپنی مخصوص اردو میں جب بڑے چاؤ سے میرا حال پوچھتے ہیں تو لگتا ہے شریانوں میں پہاڑی نالد کی طرح خالصیں مانا ہوا خون اچانک ایک دشال سمندر کی طرح شافت ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں ”حضور والا! آپ کا بلڈ پریشر تو صدقی صدم معتدل ہے۔“ اور میں کہتا ہوں ”ڈاکٹر صاحب! تصور میری بیماری کا نہیں بلکہ آپ کی اردو کا ہے۔ آپ مرض کی کیفیت مجھ سے کسی اور زبان میں پوچھ کر تو دیکھیں تب آپ کو پتہ چلتے گا کہ میرا بلڈ پریشر غیر معتدل ہے۔ سارا گھپلا میرے مرض کا نہیں، آپ کی اردو کا ہے۔ آپ کی اردو سے میرے منہ پر جو رونق آ جاتی ہے۔ اس سے آپ سمجھتے ہیں کہ میرا حال اچھا ہے۔“

ڈاکٹر میس بابر کے طریقہ علاج سے میں سر اسرنا و اتف ہوں۔ لیکن قیاس اٹلب ہے کہ ان کے اکثر مریض تو ان کی اردو سے عی ثحیک ہو جاتے ہوں گے۔ ڈاکٹر میس بابر ادب کا نہایت گمرا اور سترہ اہوا ذوق رکھتے ہیں۔ آخر کیوں نہ رکھیں۔ اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذریہ احمد کی پانچویں پشت سے جو تعلق رکھتے ہیں۔ میں انہیں پچھلے دس دنوں سے لگاتار دیکھ رہا ہوں۔ اردو ان کے لئے اوڑھنا پچھوٹا تو ہو سکتی ہے لیکن اردو میں اٹھنا بیٹھنا اس بیٹھک ممکن نہیں جب تک کوئی اس زبان کو اپنی طرز معاشرت اور زاویہ نگاہ کا حصہ نہ بنالے۔ کیا عجب کہ اردو زبان ان کے طریقہ علاج کا بھی ایک لازمی جز ہو۔ یعنی ممکن ہے کہ وہ اپنے مریضوں کو ضروری دوائیں دینے کے بعد اپنے نئے بھی تجویز فرماتے ہوں کہ ”میاں! صحیح میں ناشستہ سے پہلے میر کے دو شعر پانی کے ساتھ پڑھ جاؤ اور رات میں موئے سے پہلے غائب کی ایک غزل دو دھ کے ساتھ پی جاؤ۔“ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعض مخصوص امراض کے علاج کے لئے مریضوں کو کسی شاعر کا مجموعہ کلام بھی مطالعہ کے لئے دیتے ہوں اور قیاس اٹلب ہے کہ اس مجموعہ کلام پر جلی حروف میں یہ عبارت بھی درج ہوتی ہوگی، ”SHAKE THE BOOK BEFORE USE.“

کسی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر شمس بابر پچھلے ایک مہینے سے مزاجیہ مشاعرے کے انقاو کے لئے دن رات مصروف عمل رہے ہیں اور اپنے مریضوں کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہے ہیں۔ اس پر میں نے ان کے سامنے ایک جائز اندریشہ کا اظہار کیا کہ اگر اس عرصے میں ان کی عدم توجیہ کے باعث ان کے مریض خدا نخواستہ خود نخود شفایاب ہو جائیں تو کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر شمس بابر کے ہذفون پر ایک ایسی اردو مسکراہٹ سمجھیں گئی جوار و وزبان اور ان کے مریض دلوں کی سخت جانی پر ان کے بھرپور اعتماد کی ترجیح تھی۔ وہ یوں فتنے جیسے کہنا چاہتے ہوں ان کی زبان اور ان کے مریض بڑیاں تو رگڑ سکتے ہیں لیکن مرنہیں سکتے۔

ایک اچھے ڈاکٹر ہونے کے باوجود ایک نہایت مخلص، بے لوٹ، نیک نفس اور شریف انسان ہیں۔ ڈاکٹروں میں اور تو کئی خوبیاں ہو سکتی ہیں لیکن مندرجہ بالا خوبیاں تو کئی پچھالو جیکل ٹیسٹس کے باوجود کسی ڈاکٹر میں تاثر نہیں کی جاسکتیں۔ جو ڈاکٹر شلطی سے بے حد شریف نفس واقع ہونا ہے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر کم از کم مجھے تو شہر سا ہونے لگتا ہے۔ میرا حقیدہ ہی نہیں تجربہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اکثر مریض ڈاکٹر کی دوسرے کم اور اس کی جھٹکی سے زیادہ شفایاب ہوتے ہیں۔

یادش تھیر! دلن ماں الوف کے ایک اور شریف نفس ڈاکٹر کی مجھے یاد آگئی جواب پر مریضوں کی کثرت کے علاوہ اپنی بیویوں کی کثرت کے لئے بھی شہرت رکھتے ہیں ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھلیا "حضورا آخراً آپ نے اتنی ساری شادیاں کس طرح کر لیں؟"

نظر میں جھکا کر بولے "خدا کو اے اس میں میری ذاتی کاوشوں اور کوششوں کو بالکل غل نہیں ہے۔ کم از کم دو شادیاں تو اس طرح ہوئیں کہ میں نے مریضہ جان کر ان کی بخش مبارک پر ہاتھ رکھا اور مریض نے ولی زبان میں فرمایا" دیکھئے ڈاکٹر صاحب ایسے جو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے تو وہ ددہ کیجئے کہ زندگی بھر میرا ہاتھ اور ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ سچا مرد وہی ہوتا ہے جو ایک بار ہاتھ پکڑتا ہے تو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتا۔" چاروں چار مجھے بنا پش سے شوہر اور انہیں مریض سے میری اہلیہ بناؤ پڑا۔ یہ تو خیر ایک لطیفہ مفترضہ تھا۔ ڈاکٹر شمس بابر ان لوگوں میں سے ہیں جن سے مل کر

انسان اور انسانیت پر پھر سے اعتقاد بحال ہو جاتا ہے۔

میں یہاں اپنے عزیز ترین دوست اور دوچار کے معتمد محموی شریف اسلم کا ذکر کرنا بھی ضروری تصور کرتا ہوں۔ میں ان کا شکریہ اس ذرے سے اوپر نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں وہ اسے سچ مجھ قبول نہ کر لیں۔ میں جانتا ہوں کہ ”قبول کیا“ والا جملہ ان کے لئے تکمیل کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ شریف اسلم میرے اس زمانے کے دوست ہیں جب آتش نہ صرف جوان خالکہ بھی بچتا ہے۔ یہ پہلی دوپہلی کی بات نہیں نصف صدی کا فتح ہے۔ شریف اسلم کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ ہم دونوں کے اپنے کئی راز ہیں جو ہم دونوں کے سینوں میں دُن ہیں اور اب جب کہ ہم اپنی اپنی تاریخ پیدائش سے دور اور اپنی تاریخ دفاتر سے تربیب ہوتے جا رہے ہیں ان رازوں کا پوشیدہ رہنمای بہتر ہے۔ شریف اسلم یہاں آ کر جس طرح کی منظم، معتدل اور صالح زندگی گذار رہے ہیں اسے دیکھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اگر شریف اسلم بھی ہو تو اس کے بدلتے دری نہیں لگتی۔ اس یاد طرحدار کی کتنی باتیں ہیں جواب یاد آرعنی ہیں۔ مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہم ان باتوں کی وہی نیز کو پچلا نگہ کر بہت آگے نکل آئے ہیں۔

میں یہاں خصوصیت کے ساتھ حیدر آباد کی مشہور سماجی کارکن محترمہ سلیم اشرف صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کے شعراء اور ادیبوں کو یہاں لانے کا سہرا سلیم آپ کے سر ہے۔ سفر سے پہلے، سفر کے دوران اور سفر کے بعد انہوں نے جس طرح ہمارا خیال رکھا اور اب تک رکھتی چلی جارعنی ہیں اس کا شکریہ لفظوں میں ادا ہوئی نہیں سکتا۔ بہن کی محبت کیا چیز ہوتی ہے اسے میں تقریباً بھول چکا تھا۔ سلیم آپ کی گمراہی میں یہاں تک سفر کرنے کے دوران میں، میں نے نئے سرے سے بہن کی محبت کی بازیافت کی ہے۔ ان کی فراخدا لانہ مہماں نوازی مدوں یاد آتی رہے گی۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ اپنے ٹمن و اپس جا کر میں پھر سے اپنی دال روٹی پر کس طرح گزردہ کروں گا۔

حضرات! جب میں یہاں آیا تھا تو گناہوں کا بوجھ میرے کندھوں پر تھا اور اب واپس

جانے لگا ہوں تو آپ سب کے احسانات کا بوجھی سرے کندھوں پر ہے۔ ہوا جہاز میں شاید میں اس بوجھ کو "ہینڈ کیری" HAND CARRY بھی نہ کر سکوں گا۔ اس لئے اس بوجھ کو دل میں چھپا کر لے جاؤں گا کیونکہ جسم کا یہی تودہ عضو ہے جو بوجھ اٹھانے پر آتا ہے تو غموں کے بھاری پہاڑوں تک کو اٹھا لیتا ہے۔

میں پھر ایک بارہم اردو جدہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی معرفت مجھے اس ارض مقدس پر آنے کی سعادت حاصل ہو سکی۔ اردو کی بعض بستیاں اجری ہیں تو نئی بستیاں آباد بھی ہو ری ہیں۔ اور ان بستیوں کو آباد کرنے میں آپ حضرات کی بے لوث کامتوں کو کمی فراہوش نہیں کیا جاسکتا۔



رام پور میں دو دن

اولہر کچھ دنوں سے شمالی ہند کے شہروں میں خاصا طنز و مزاح ہو رہا ہے (ادب اور سیاست دنوں سطحون پر) لکھنؤ، چندی گڑھ اور پٹنہ تو خیر بڑے شہر ہیں، امر و بہم تک طنز و مزاح کی زد میں آ چکا ہے۔ چنانچہ پھرلے دس مہینوں میں ہم دوبار وہاں جا چکے ہیں۔ تیسری مرتبہ بھی بلایا تھا مگر ہم اس ڈر سے نہیں گئے کہ کہیں امر و بہم والوں کا طنز و مزاح کی بدھنسی نہ ہو جائے۔ اس بار رام پور والوں کی غیرت نے للاکار اتو ۶۰ رمارچ کو ایک "شب قہقہہ" کا اہتمام کر دیا۔ ہمیں طنز و مزاح سے کچھ زیادہ سر دکار نہیں ہے۔ ہماری خوبیش تو بس اتنی رہتی ہے کہ بس طنز و مزاح کی آڑ میں کچھ شہر دیکھنے کو مل جائیں۔ رام پور جانے کو یوں بھی جی چاہتا تھا اس لئے کہ اتر پردیش میں اردو کے جو چند جزیرے باقی رہ گئے ہیں ان میں رام پور خاصا بڑا جزیرہ ہے۔ پھر رام پور کے فنوں اور شاعروں سے ہماری یادِ اللہ ہے۔ غصب کے شعر کہتے ہیں مگر کوششی کی زندگی گذارتے ہیں اور اپنی کوششی کو رام پور کی مخصوص تہذیبی روایت کی پاسداری کا نام دیتے ہیں۔ رام پور میں شاعروں کی بہتات کے بارے میں کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ تین سال قبل ایک ادب دوست نے رام پور کے شاعروں کی ایک فہرست مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ پانچ سو شاعروں کی فہرست مرتب ہو چکی تھی کہ بیچارے ادب دوست کو داعیِ اجل نے لدیک کہنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد کسی نے اس فہرست کو آگے نہیں بڑھایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہم رام پور جانے لگے تو ہمارے ایک راپوری دوست نے تنبیہ کے انداز کہا "مختیار رام پور جاؤ تو وہاں کوئی پتھر نہ اٹھانا۔"

ہم نے پوچھا "کیا پتھر کے نیچے سے بچھوٹتا ہے؟" بولے "نہیں اردو کا شاعر سلام عرض کرتا ہوا بہ آمد ہوتا ہے اور پھر مطلع کا ذکر مارتا ہے۔"

چنانچہ رام پور میں دور روزہ قیام کے دوران ہم نے کوئی پتھرنیں اٹھایا تاہم جس ہوں میں
ہم فردش تھے اس کے بیرونے از راہ عنایت اپنی بیاض میں سے دل عدو غزالیں چھوٹی بھر میں
سنا نہیں اور بعد میں اسی بیاض پر اپنی شاعری کے بارے میں ہم سے رائے بھی لکھواں۔ یہ پہلا
موقع تھا جب کسی شاعر کے کلام کے بارے میں ہم نے اپنی قیمتی رائے دی۔ رائے دینے میں
ایک لائق یہ بھی تھا کہ ہمیں ہوں میں وقت پر چائے مل جائے اور کھانا وغیرہ بھی اچھا ملنے۔ سواس
کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں کھانا، ہمیشہ بڑی بھر میں ملا۔

رام پور کی "شب قہقہہ" میں جو کچھ ہواں کا حال ہم اس لئے نہیں لکھیں گے کیونما ایسے
پوگراہوں میں ہنسنے بسانے اور بھی بھی خاٹھا کرنے کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مگر طرزِ خراج
کے لئے لوگوں کی دلچسپی پر ہمیں حیرت ہوئی۔ اول تو یہ کہ ہمیں اور فکرتو نسوی کو جس موڑ کے ذریعہ
رام پور لے جایا گیا وہ خود خاصی طرزِ بہزادہ مورثی اور بڑی ادب شناس بھی تھی۔ چنانچہ پہلی مرتبہ
وہ ہاپوڑ پر محض اس لئے خراب ہوئی کہ مولوی عبدالحق کا ہاپوڑ سے گہر اعلق رہا ہے۔ دوسری مرتبہ وہ
رمیں المعنی لین حضرت جگہ مراد آبادی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مراد آباد پر کچھ اس
انداز سے خراب ہوئی کہ جگہ مراد آبادی کے کئی شعر جنہیں ہم بھول چکے تھے وہ پھر سے یاد آگئے۔
فکرتو نسوی تو جگہ مراد آبادی کو یاد کرتے رہ گئے اور ہم نے دوسروں کی نظریں پچا کر مراد آباد کے دو
لوئے خرید لئے۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

برتنوں کا کار گیر ان لوٹوں پر ہمارا نام بھی لکھنا چاہتا تھا لیکن ہم نے یہ کہہ کر اسے منع کیا کہ
اویب ہونے کے تھے ہمارا نام رسالوں وغیرہ میں خاصاً چھپتا رہتا ہے۔ اس لئے تصنیف و تالیف
کے معاملہ میں لوئے کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال یہ ہوڑ جگہ جگہ متقدہ میں کی روحوں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہوئی جب رام پور پہنچی تو

رات کے بارہ نجح رہے تھے۔ ہمارے ساتھ رام پور کے انسانہ نگار فضیلیت اور مشہور ادیب شاہد پروین بھی تھے۔ ”شب تہقیہ“ کا پروگرام چونکہ رات کے آٹھ بجے شروع ہوا تھا اس لئے ہم اس خوش نیحی میں بتلا تھے کہ ہمارے انتظار میں جلسہ چلا یا جا رہا ہوگا۔ چنانچہ اس وقت تک مزایدہ مشاعرہ اپنے پانچویں دور میں داخل ہو چکا تھا۔ غرض ہم لوگوں نے جلسہ کو جلدی جلدی پنچایا کہ بھوک بہت لگ رہی تھی۔

وہرے دن ہم رام پور دیکھنے چے۔ جدھر جائیئے لوگ رام پور کے نوابوں کا ذکر کرتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی عمارتیں دکھائی گئیں۔ رام پور کا قلعہ بھی دیکھا جو ہندوستان کے قلعوں میں سب سے کم عمر ہے۔ اس لئے کہ اسی (۸۰) سال پہلے بنा ہے۔ اس قلعہ کو جگ لانے کے پرانے طریقوں کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے حالانکہ اسی (۸۰) سال پہلے جنگ لانے کے نئے طریقے منظر عام پر آچکے تھے۔

ہم نے پوچھا ”بھی ۱۸۷۵ سال پہلے بنے ہوئے قلعے کو پانچ سو سال پرانے قلعوں کے قریب اُن پر کیوں بنایا ہے؟“ ارشاد ہوا ”بھی انوب رامپور نے جنگ لانے کے لئے تھوڑا ہی قلعہ بنوایا تھا۔ یہ قلعہ تو نہوں نے محض اس لئے بنایا تھا کہ روایتی قلعہ کے بغیر نوبی کا مزہ نہیں ہے۔“

ئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

رام پور جانے سے پہلے ہم نے طنے کر کھا تھا کہ رام پور کے تامل دید نارنجی مقامات میں سب سے پہلے ممتاز محقق اور ماہر غالیبات مولانا امیاز علی عرشی کو ضرور دیکھیں گے۔ مگر رام پور کے احباب میں ”نواب رام پور“ کے چکر میں پھسانے چے جا رہے تھے۔ ہم بھلا کہاں چکر میں آنے والے تھے۔ سو ہم نے برملا اپنی خواہش کا اظہار کیا اور نواب رام پور کی نارنجی عمارتوں کو ان کے حوال پر چھوڑ کر ہم مولانا امیاز علی عرشی سے طنے ”رضالاہبری“ چلے گئے۔ رضالاہبری

ہندستان کی ان چار لاٹبریوں میں سے ہے جہاں فارسی اور عربی کے بے شمار مخلوطے موجود ہیں۔ اگرچہ کتابوں سے ہمارا کچھ زیادہ سر و کار نہیں ہے مگر جب بھی اپنے طرف کتابوں کے انبار کو دیکھتے ہیں تو جی کو روز آرام آتا ہے۔ مولانا اقبال علی عرشی کو جب یہ اطلاع ہوتی کہ وہ طنز و مزاح نگاران سے ملنے آئے ہیں تو انہوں نے فوراً ہمیں اندر بلایا۔ مولانا کو ہم نے ویسا یہ پلایا جیسا کہ ان کے بارے میں سن رکھا تھا۔ چاروں طرف سے کتابوں میں گھرے جیٹھے تھے۔ مولانا عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں چنان پھرنا بھی دیکھ رہا جاتا ہے مگر بڑی وضع داری کے ساتھ سیاہ شیر والی پہنچ آرام کری پر جیٹھے مطالعے میں غرق تھے۔ کری سے اٹھنیں سکتے تھے۔ اس لئے نہ اٹھنے کی معدودت چاہی۔ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر احساس ہونا ہے کہ آپ انہیں خواب میں دیکھ رہے ہیں۔ مولانا جیسی شخصیتیں اب کہیں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ اس لئے ہم لوگوں نے مولانا کو جی بھر کر دیکھا۔ مولانا بہت دیر تک اردو زبان کے بارے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ پھر بولے ”میں کوششیں کی زندگی گذارہا ہوں۔ اتنی عمر گذارنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بد لئے ہوئے حالات میں اردو کی بقا کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اردو کو آسان بنایا جائے۔ میں نے آج تک اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا مگر آج آپ لوگ آئے ہیں تو آپ کے سامنے لپنے دل کی بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ بھی اس پر غور فرمائیے۔“ ہم نے کہا ”مولانا! ہمیں غور کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اگر آپ کہیں تو ہم آپ کے خیالات کو لکھ کر چھپوادیں گے۔ جن لوگوں کو غور کرنا ہے وہ غور کرتے رہیں گے۔“

بولے ”مجھے پتہ ہے کہ میرے خیالات چھپیں گے تو لوگ میرے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں گے مگر میں زبان کی بقا کو اللہ سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ اس لئے آپ شوق سے میرے خیالات اردو والوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ پھر فرمانے لگے ”میری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ اردو میں تذکیر و نیشت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔“ ہم نے کہا ”مولانا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دنیا کے سارے کار و بار تو تذکیر و نیشت پر چلتے ہیں اور زندگی کا سب سے بڑا لطف بھی اسی میں ہے۔“ بولے ”زندگی میں تو تذکیر و نیشت چلتی رہے گی مگر میں زبان میں اسے ختم کرنا چاہتا

ہوں۔ اردو میں تذکیرہ نیت کو ہم نے عربی سے اپنایا ہے جب کہ فارسی والے تذکیرہ نیت کے چکر میں پڑتے۔ انگریزی میں بھی تذکیرہ نیت نہیں ہے۔ انگریزی میں لڑکا اور لڑکی دونوں "I AM GOING." کہہ سکتے ہیں مگر اردو میں لڑکی کو "میں جا رہی ہوں" اور لڑکے کو "میں جا رہا ہوں" کہنا پڑتا ہے۔

ہم نے کہا "مولانا کیا آپ کے خیال کے مطابق لڑکی کو بھی میں جا رہا ہوں کہنا چاہئے؟" بولے "بالکل کہنا چاہئے۔ اردو شاعری میں تو پچیس تیس برس پہلے تک محبوب کو نذر کرنی باندھا جاتا تھا۔ اس وقت کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ اہر جدید شاعروں نے ہی اردو شاعری میں محبوب کی جنس کو تبدیل کیا ہے۔ اگر ہم تذکیرہ نیت کو ختم کر دیں تو زبان بہت آسان ہو جائے گی۔ اگر کوئی اردو زبان سیکھنا چاہے تو اسے پہلے یہ معلوم کرنا پڑتا ہے کہ "صومیت"، "شرف"، "جبل" اور "علم" وغیرہ جیسے الفاظ نہ کر ہیں یا مؤمن جب کہ فارسی اور انگریزی میں ان الفاظ کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ صرف صفت ہوتی ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر ہم تذکیرہ نیت کے چکر سے آزاد ہو جائیں تو دہروں کے لئے زبان کو سیکھنا آسان ہو جائے گا۔" (ہم نے جی ہی جی میں کہا مولانا کا تجویز اچھا تو ہے مگر اس پر عمل کرنے میں بہت دشواری آئے گا۔) پھر مولانا کو یہ ہوئے "تذکیرہ نیت کے اس جگہ رے کے باعث فارسی کے مقابلے میں اردو کو سیکھنا دس گنا زیادہ دشوار ہے۔" ہم نے کہا "مولانا! مگر یہ بھی تو سوچنے کہ اردو کا علاقہ وہی ہے جو ہندی کا ہے اور ہندی میں جب تک تذکیرہ نیت چلتی رہے گی تب تک اردو میں بھی چلتی رہے گی۔ ہم اس سانی رشتے سے کیسے الگ ہو سکتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہندی میں بھی تذکیرہ نیت کو ختم کیا جائے۔"

بولے "میں تو اردو زبان کو آسان بنانے کے بارے میں ایک تجویز پیش کر رہا ہوں۔ ہندی والے اپنے طور پر غور کریں۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اردو میں س، ص اور ش کے لئے ایک ہی حرفاً "س" ہوا چاہئے۔ ہمارے ہاں جو "سکی" لکھا جاتا ہے وہ اصل میں لفظ "صحیح" کی ایک شکل ہے (اسکے ثبوت میں مولانا نے ایک شعر بھی پڑھا تھا جواب یاد نہیں رہا) اسی طرح اردو کے کئی اور ہم آواز حروف کو کم کیا جا سکتا ہے۔ عوام جسے قبول کریں اسے مان لیما چاہئے۔ مثلاً ہمارے

ہاں ”اڑدہام“ غلط لکھا جاتا ہے۔ صحیح لفظ ”ازدہام“ ہے مگر ”اڑدہام“ لکھنے والوں کی اکثریت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ ”اڑدہام“ کو عی صحیح مان لینا چاہئے۔ ہماری قوہ سے مشکل ہے۔ ہمارے ہاں ”جانے“ کا ماضی گیا، بن جانا ہے جب کہ اصولاً اسے ”جیا“ ہونا چاہئے۔ بہر حال اردو زبان کی بتا اسی میں ہے کہ اسے آسان بٹلیا جائے ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔

رضا لاابریری کے بارے میں مولانا نے کہا ”ہمارے ہاں عربی اور فارسی کے بے شمار مخطوطے ہیں مگر فسوں کی اتنی بڑی لاابریری سے استفادہ کرنے کے لئے سال بھر میں مشکل سے دس بارہ اسکال آتے ہیں اور وہ بھی معلومات کے اس ذخیرے سے استفادہ کرنے کے ال نہیں ہوتے۔“

جب ہم جانے لگتے تو مولانا نے کہا ”میں آپ حضرات کی تشریف آوری کا شکر یہ کس زبان میں ادا کروں؟“ ہم نے کہا ”مولانا! شکر یہ تو اردو زبان میں ہی ادا کیجئے گا تذکرہ دنیا بیث کے ساتھ۔“ رضا لاابریری سے باہر نکلنے تو فکر تو نسیبی بڑے کمیسر تھے۔ کہنے لگے ”یا را مولانا نے باقی بہت صحیح کہیں ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم صحیح باتوں کو نہیں مانتے۔ اب ایسے لوگ اردو میں کہاں باقی ہیں۔“

اس ملاقات کے بعد دو چار گھنٹوں تک ہم اور فکر تو نسیبی تذکرہ اور دنیا بیث کے بغیر اردو میں بات کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب طبیعت گزرنے لگی تو پھر راپور کی تاریخی عمارتوں میں کھو گئے اور درمیں دن دلی و اپس آگئے۔



مختین حسین کے بارے میں تحقیقی مواد

مختین حسین کافن : پروفیسر تکمیل احمدی، نومبر 2010 یہم آرچیو گل کشنز 10، میزروپول مارکٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی - 110002.

مختین حسین نمبر ماہنامہ شیخو: نومبر 1987، ایڈیشن: ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، 31 بیچلرس کوارٹس، معظم جاہی مارکٹ، حیدر آباد - 500001.

مختین حسین بحثیت خاکہ شاہ : سردار پاشا 1996، گلبرگہ
خصوصی محلہ : جشن مختین حسین منعقدہ شارجہ: 1997، آر اس پر ووسن یورپ، شارجہ (بواسی)

مختین حسین اور فنِ حراج ٹاری: حسن مٹی، 2003، ایلیا چبلی کیشن، دہلی - ماذرن پبلیکیشن ہاؤس، 9، گولہ مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002.

مختین حسین بحثیت طریفہ : ڈاکٹر افرکانی، 2004 ماذرن پبلیکیشن ہاؤس، 9، گولہ مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002.

مختین حسین (فن اور شخصیت): خصوصی شارع "کتاب نما" مرتبہ: ڈاکٹر محمد کاظم 2004 مکتبہ جامعہ لیونڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی - 110025.

مختین حسین - ایسا کہاں سے لا لوں: پروفیسر شفیع شیخ، 2005 سینیک بک اینجنسی، 53 ایسا نیم رحمت اللہ روڈ، 11، ایمن بلڈنگ، گھنی - 400003.

مختین حسین کی حراج ٹاری : پیرزادہ ارشاد احمد، 2007 رام پورہ، باندی پورہ، کشمیر
مختین حسین بھرگلبرگ : مرتبہ: احسان اللہ احمد، 2008 انجمن ترقی اردو ہند، گلبرگہ، اشیش روڈ، گلبرگہ (کراچی)

اردو ادب کے تین بھائی : مرتبہ: رفیق جعفر، 2008 حاجی خلام محمد عظیم انجوکیشن ٹرست، 2390، خان بہادر ہدایت اللہ روڈ، عظیم کیپس، پونے 411001

مختلف رسالوں، ماہنامہ صبا، حیدر آباد ☆، الگا ڈائلی گز ہر ☆ ماہنامہ انشاء، کولکاتا ☆ ماہنامہ شاعر، مختین ☆ ماہنامہ سب رس، حیدر آباد ☆ ماہنامہ عدسه، حیدر آباد ☆ سہ ماہی الانصار، حیدر آباد کے علاوہ روزنامہ جنگ، کراچی ☆ روزنامہ آزاد ہند، کولکاتا ☆ روزنامہ جنگ، لندن ☆ روزنامہ آفتاب، بھوپال ☆ روزنامہ حصہ، حیدر آباد کے خصوصی گوشے۔ ☆☆

سفر لخت لخت

سفر لخت لخت